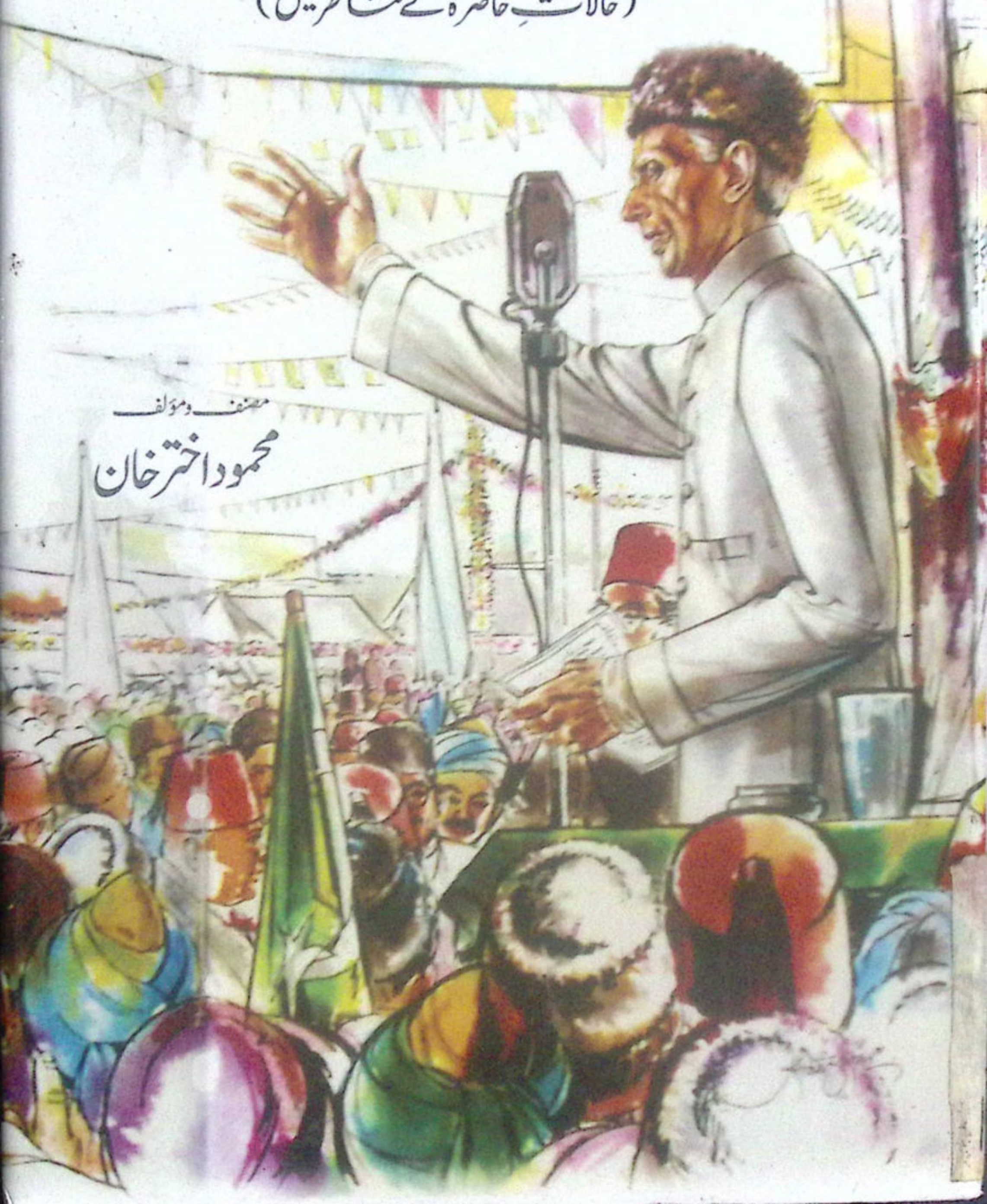
ہم اور قائدِ اعظم

(حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں)



مصنف و مؤلف

محمود اختر خان

ظ

ہم اور قائدِ اعظم

(حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں)

مصنف و مؤلف:

محمود اختر خان

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعؔر
0336-2085325

کتاب	:	ہم اور قائد اعظم (حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں)
مصنف و مؤلف	:	محمود اختر خان
اشاعت	:	اکتوبر 2018ء
زیرِ اہتمام	:	کاروانِ فرزانِ ادب، کراچی R-86، بلاک 15، فیڈرل بی ایریا، کراچی 0321-3902513
تزئین کار	:	شیرازی شاعر 0300-2054154
پرنٹر	:	محبوب پریس، کراچی
تعداد	:	500
صفحات	:	160
قیمت	:	=/500 روپے

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے
رنگِ ادب پبلی کیشنز
آفس نمبر 5- کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی
021-32761100 - 0345-2610434
www.facebook.com/rangeadab - rangeadab@yahoo.com

شکیل عادل زادہ

کے نام

"ہم سب پاکستانی ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی سندھی، بلوچی، بنگالی، پٹھان یا پنجابی نہیں ہے۔ ہمیں صرف اور صرف اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔"

قائدِ اعظم محمد علی جناح
(15 رجون 1948ء)

فہرست

مقدمہ

مضامین

مشاہیر کے مضامین

ترجمہ

◆◆◆

مقدمہ

محمود اختر خان...... بہ حیثیت تاریخ نگار

''تاریخ نگار محمود اختر خاں کی تصنیف ''ہم اور قائداعظم''
تاریخی تناظر میں ایک اہم سنگِ میل ہے اور گراں قدر اضافہ بھی ہے۔''

مجید فکری

محمود اختر خاں شعبۂ صحافت سے وابستہ ہیں اور اس مناسبت سے ان کا بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کو اپنی تصنیف کے لیے بہ طور عنوان منتخب کرنا اس بات کا غماز ہے کہ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی اور مملکتِ پاکستان سے بے پناہ محبت و رغبت اور وابستگی رکھتے ہیں، نیز حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں ہم پاکستان سے اپنی محبانہ سرگرمیاں اور بہ حیثیت شہری اپنی ذمے داریوں کو کس حد تک نبھا پا رہے ہیں؟

میں نے ان کی زیرِ نظر تصنیف ''ہم اور قائداعظم'' کو بالاستعیاب مبصرانہ تناظر میں پڑھا ہے جس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ وہ ایک اچھے تاریخ نگار، حقائق و واقعات کو پیشِ نظر رکھنے والے محقق و تجزیہ کار بھی ہیں۔ ان کو تحقیق و تصنیف پر پورا عبور حاصل ہے اور انہوں نے برصغیر ہندوستان کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے سب حقائق و اسباب کو قارئین کے سامنے بڑی حقیقت نگاری کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ یہی نہیں انہوں نے سوانحِ قائداعظم کو بھی بڑی بصیرت اور جامعیت کے ساتھ مدِ نظر رکھتے ہوئے نہ صرف صفحۂ قرطاس پر پینٹ کر دیا ہے بلکہ ان حالات و واقعات سے خود اپنے لیے بلکہ ہم سب کو جو پاکستان سے محبت و عقیدت کا دم بھرتے ہیں بسا

اوقات تھوڑا سا شرم سار بھی کیا ہے کہ ہم نے اپنے قائد کے زریں اُصولوں کو بھلا دیا بلکہ ان سے روگردانی بھی کی اور انہیں بالائے طاق رکھ کر اپنی عدم رغبت، اپنی حب الوطنی کو بھی مشکوک کرنے کا ثبوت فراہم کیا۔ یہ بڑا المیہ اور سوچ و بچار والا گمبھیر مسئلہ ہی نہیں بلکہ کسی الم ناک سانحے سے بھی کم نہیں! لفظ سانحہ میں نے اس لیے بھی استعمال کیا ہے کہ ماضیِ قریب میں ہم اپنے ملک کا نصف حصہ جو مشرقی پاکستان سے موسوم تھا گنوا بیٹھے اور آج بھی اس قلق کو بھول جانے کے علاوہ موجودہ مغربی پاکستان سے اپنی خلوص دل سے والہانہ وابستگی کا اظہار کرتے نظر نہیں آتے ہیں۔ واقعتاً یہ اس مملکتِ پاکستان سے محبوبانہ عقیدت کا بڑا نا گفتہ بہ اظہار ہے جس پر کفِ افسوس نہ ملنا اور اس کوتاہی پر نادم نہ ہونا بھی کسی ڈھٹائی اور کم ظرفی سے کم نہیں!

محمود اختر خاں کے بیان کردہ حقائق و واقعات اور محسوسات و جذبات محض محبانہ قومی جذبے اور حالات و تسلسل کا احاطہ ہی نہیں کرتے بلکہ پڑھنے والے کو ایسے عمل اور جذبوں پر بھی اُکساتے ہیں جو کچھ اُصول و قواعد پر اپنی زندگیوں کو اُستوار کرنے کا درس بھی دیتے ہیں اور ممد و معاون بھی بنتے ہیں جو عہدِ حاضر ہی میں نہیں مستقبل میں بھی رہبری و راہ نمائی کا مرکز و منبع ثابت ہو سکتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید مصنف نے اسی مطمعِ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی زیرِ نظر کام یاب تاریخی تصنیف کا حصہ بنایا ہے۔

ان کا اندازِ تحریر اور اُسلوبِ قدیم تاریخی انداز و اُسلوب سے نہ صرف منفرد ہے بلکہ نیم جدید کاوشی تحریری تاریخ کا بے مثال مرقع بھی ہے۔ انہوں نے قدیم روایت، پرانی تاریخ نگاری سے بھی اپنا رشتہ جوڑے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ذہین تخلیق نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں اور نیم جدید تاریخی ناول نگار کے طور پر اپنی شناخت کا سبب بنے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ایک نئے تاریخی اندازِ نگارش کے ساتھ ہمارے ملّی و قومی سفر کی تاریخی سرگزشت کو لے کر تاریخی روایت کے کارواں کو آگے اور مسلسل آگے لے جانے کی منزل پر گامزن ہیں اور شاید ہمہ تن گوشی و سرشاری کے ساتھ اپنی سعی و کاوش میں منہمک اور مصروفِ عمل نظر آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی تاریخ داں حقائق و واقعات کو پسِ پشت ڈال کر نیا تاریخی ادب تخلیق نہیں کر سکتا۔ کتنا ہی جدید تاریخی و تہذیبی اندازِ تخاطب اپنایا جائے اس کی بنیاد روایت سے

جڑی ضرور نظر آتی ہے جسے انہوں نے اپنی تاریخ دانی میں نظر انداز بھی نہیں کیا اور بڑے حسن و خوبی کے ساتھ رواں، سہل اور حقائق سے مربوط بیان کو آگے لے کر چلے ہیں اور اپنے اسی منفرد اندازِ نگارش سے انہوں نے اپنی تاریخی تصنیف ''ہم اور قائداعظم'' کو ''امر'' بنادیا ہے۔ گو اس سے پہلے بھی وہ تاریخِ پاکستان پر کسی نہ کسی طور پر اپنی نگارشات کا جوہر دکھاتے رہے ہیں۔ مجھے قوی یقین ہے کہ وہ ایک تاریخی قلم کار ہیں اور انہیں تاریخ وتحریر پر خصوصاً پاکستانی تاریخ پر عبور ہی نہیں مہارت ودسترس بھی حاصل ہے۔

محمود اختر خان نے اپنی تصنیف کا آغاز ہی قائداعظم کی حیات سے متعلق ابتدائی مہ وسال سے کیا ہے اور قائداعظم کی ولادت سے مربوط سیاسی وصف اور سیاست سے حاصل کردہ مملکتِ اسلامیہ پاکستان کا ذکر بھی مرحلہ وار ماہ وسال اور واقعات کی روشنی میں اس طرح بیان کرنا شروع کیا ہے کہ ایک سچا اور یکتا بیانیہ وہ بھی ایک دستاویزی حقائق کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے نمایاں وفروزاں سا دکھائی دیتا ہے اور پڑھنے والا واقعات وحقائق کے دل چسپ افسانوی روپ میں بلکہ ناول نگاری انداز میں اسے پڑھتا ہی چلا جاتا ہے وگرنہ لوگ قائداعظم کو بانیٔ پاکستان، تحریکِ پاکستان کے عظیم قائد کے صرف ایک لیڈر کے بہ طور ہی جانتے ہیں اور اکابرینِ ملتِ اسلامیہ کی سعی وکاوش کے جھمیلے میں ہی رہتے ہیں۔

مصنفِ موصوف کا اندازِ تخاطب تو دیکھو کہ کسے معلوم نہیں کہ قائداعظم کی ولادت ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی کے محلے کھارادر میں ہوئی مگر یہ بتانا کہ ان کے والد جناح پونجا اور والدہ مٹھی بائی تھیں جنہوں نے ایک ولیِ کامل ''حضرت پیر حسن'' کے مزار پر بچے کی ولادت اور صحت وسلامتی کے لیے منّت مانگی تھی جو پوری ہوئی یعنی ولادت کے بعد صحت وسلامتی کی دعا مانگنا ہی ضروری تھا کہ ملتِ پاکستان کے لیے ان کی جہدِ مسلسل ہی ایک دن قیامِ پاکستان کی تعمیر وتخلیق کا حصہ بنے گی۔ گو کہ ان کی صحت اتنی ہمت افزا تو نہ تھی مگر وہ اپنی تمام غیر صحت مندانہ کم زوریوں کے باوجود ہمت واستقلال اور جواں مردی جیسی صلاحیتوں کے ساتھ اپنی عقل ودانش کو محض قوم کی آزادی اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں سرگرداں رہے اور کسی دشمن پر یہ بات عیاں نہ ہونے دی کہ کسی موذی بیماری میں بھی مبتلا ہیں۔ دراصل کسی بھی قومی لیڈر کے لیے یہ باتیں لازمی اور ضروری بھی ہوتی

ہیں یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے صرف ایک سال بعد ہی وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

جب وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں سے فارغ ہوئے تو وکالت کا پیشہ پارٹ ٹائم کے طور پر جاری تو رکھا لیکن اپنی ساری توجہ آزادیِ پاکستان اور قیامِ مملکت پر ہی مرکوز رکھی۔ مصنف نے جہاں ان کی ولادت، ان کی پرورش و دیگر امورِ خانہ کا تذکرہ کیا ہے وہیں ان کی دور اندیشے والی قائدانہ صلاحیت پر بھی زور دیا ہے کہ وہ کس طرح اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے ساتھ آنے والے وقت کی کڑیوں خود ملاتے اور سیاست کے پیچ وخم سے نمٹتے رہے۔ یوں تو دیگر تاریخ دانوں نے بھی ان واقعات و حالات کو سن وار کے ساتھ شمار میں رکھا ہے مگر فاضل مصنف نے اپنے بیان و انداز دوسرے تاریخ دانوں سے ذرا مختلف ہی رکھا ہے جو قاری کے ذہن پر کسی بوجھ کا باعث نہیں بنتا بلکہ پڑھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور تاریخ و سیاست سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے ایک معلوماتِ خاص فراہم کرتا ہے۔

میری معلومات اور حافظے کے مطابق پاکستانی مصنفین نے جتنا کچھ تاریخی مواد قائداعظم کی حیات و جہات و خدمات سے متعلق اپنی تصانیف میں پیش کیا ہے وہ بھی علمی و تاریخی اعتبار سے گراں قدر معلومات کا خزانہ ہے اور آج تک ہماری لائبریریوں میں محفوظ ہے اور قائداعظم اکیڈمی جیسے ادارے کے تحت بھی مذکورہ موضوع پر مختلف تصانیف و تالیفات پر توجہ دی جاتی رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ان تصانیف و تالیفات کے ورثہ کو محفوظ اور مربوط نہیں کیا گیا تو آنے والی نسلیں قیامِ پاکستان کی تاریخ اور جدوجہدِ آزادی کی تحریک سے بھی ناآشنا رہیں گی اور حیات و جدوجہدِ قائداعظم سے بھی محروم رہ سکتے ہیں۔

شاید مورخ موصوف کے ذہن میں اسی خیال کی شدت نے اس تصنیف جو خالصتاً قائداعظم اور حیاتِ قائداعظم سے متعلق ہے اور اس بات کا ہم سے تقاضا بھی کرتی نظر آتی ہے اس تاریخی جہد کی روشنی میں ہماری کیا ذمے داریاں ہیں؟ جبھی تو مصنف نے لفظ قائداعظم کے ساتھ ''ہم'' کا صیغہ ملا کر اسے اہمیت کے قابل بنا دیا ہے۔ اسی خصوصیت کے باوصف میں انہیں ''ٹھیٹ تاریخی مصنف'' کا درجہ دیتا ہوں کہ وہ ایک مستند تاریخ داں کی حیثیت سے تاریخی ادب کے قرطاس پر خود اپنا تعارف بنتے نظر آتے ہیں وگرنہ ہم اور ہماری موجودہ نسل قائداعظم کے۔

کارناموں اور پاکستان کی جدوجہدِ آزادی میں قائدِ اعظم کو بھول چکی ہے۔

میں نے جہاں تک محمود اختر خاں کی کتاب کا مطالعہ کیا ہے تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ واقعتاً تاریخِ پاکستان اور برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کو گہرائی و گیرائی کے ساتھ دیکھنے والے مصنف ہیں بلکہ ایک ایسے عظیم محقق کے طور پر تاریخی اُفق پر نمایاں ہوئے ہیں کہ آنے والا وقت انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا اور کوئی بھی آنے والا مورخ ان کے لکھے ہوئے حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکے گا اور وہ ایک منفرد تاریخ داں کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ وہ تاریخی تحریر و واقعات لکھنے پر عبور رکھتے ہیں، وہ دورِ حاضر کے معتبر اور صاحبِ اُسلوب تاریخ داں ہیں۔ یہ امر بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ وہ تاریخ جیسے خشک اور مشکل مضمون لکھنے میں ایک شگفتہ پن، شائستہ استدلال اور بیان میں ندرت کا خیال رکھتے ہیں اور حقیقتاً اپنی اس طرزِ نگارش کے بہ طور انھوں نے تمام تاریخی مصنفین کے سامنے اپنا لوہا منوالیا ہے۔

ہمارے ملک میں اس وقت جو بے راہ روی کی فضا ہے نئی نسل جو مطالعہ خصوصاً تاریخی مطالعہ سے نابلد نظر آتی ہے اور ایسے مطالعے کے برخلاف انٹرنیٹ، سوشل اور الیکٹرونک میڈیا سے اپنی دل چسپیوں کا اظہار کرتی ہے اگر اسے اس تصنیف کی روشنی میں جو آج ہمارے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے پڑھے تو نہ صرف تاریخی حقائق، جدوجہدِ آزادی، اکابرینِ ملت کے گراں قدر اقدامات، وفاداری و ایثار سے بھی آشنا ہو سکے گی لیکن مطالعہ شرط ہے۔ وگرنہ وہ وقت دور نہیں کہ اس مملکتِ پاکستان کے ساتھ اور محبِ وطن شہریوں کے ساتھ وہ سلوک روا رکھا جائے گا جس کی تاریخ میں مثال نہ مل سکے گی اور ہم دیکھ بھی رہے ہیں کہ بین الاقوامی سازشوں کا جال بچھ چکا ہے، اور ہم سرتاپا اس میں پھنستے جا رہے ہیں، اس لیے ہمیں فوراً چوکنا ہو جانا چاہیے:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ وہ نعرہ تھا جو آزادی سے قبل لگایا گیا مگر اس پر آج بھی غور کرنا چاہیے۔

•••

مضامین

معلوماتِ قائدِاعظم
(ماہ وسال کی روشنی میں)

محمود اختر خان

قائداعظم محمد علی جناح کا خاندانی نام ''محمد علی'' رکھا گیا، وہ 25/دسمبر 1876ء کو کھارادر کراچی میں جناب ''جناح پونجا'' اور محترمہ ''مٹھی بائی'' کے گھر پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ محترمہ مٹھی بائی نے ولیِ کامل ''حضرت حسنؒ پیر'' کے مزار پر بچے کی ولادت اور صحت وسلامتی کے لیے منّت مانگی تھی جو پوری کرنے کے لیے محمد علی کو حضرت حسنؒ پیر کے مزار پر لے جایا گیا جو علاقہ ''گھنود'' میں واقع تھا۔ گھنود جناح پونجا کے آبائی گاؤں ''پنیلی'' سے دس میل دُور تھا۔ حسنؒ پیر کے مزار پر جا کر محمد علی کے سر کے بال اُتارے گئے اور اُن کی صحت وتن درستی کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔

1882ء میں محمد علی جناح کی ابتدائی تعلیم کا آغاز کراچی سے ہوا، اور 1887ء تک جب جناح کی عمر دس سال تھی، اُن کو گھر پر ہی مذہبی اور گجراتی وانگریزی زبان کی تعلیم دی گئی۔ 4/جولائی 1887ء کو محمد علی جناح کو ''سندھ مدرسۃ الاسلام''، کراچی کے انگلش ڈیپارٹمنٹ میں داخل کرا دیا گیا جہاں سے اُن کی باقاعدہ رسمی تعلیم کا آغاز ہوا۔ وہ 5/جنوری 1891ء کو بمبئی گئے وہاں اُنہوں نے کچھ دن ''انجمنِ اسلام'' اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ 9/فروری 1891ء کو دوبارہ سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی میں داخل ہو گئے۔ محمد علی جناح دسویں جماعت میں تھے کہ اُنہوں نے اپنے نکاح کی تاریخ طے پا جانے کی وجہ سے 30/جنوری 1892ء کو اسکول کی تعلیم کو خیرآباد کہہ دیا۔ 16 سال کی عمر تھی کہ ''راج نوٹ'' کے قریب قصبہ ''بن بانا'' کے تاجر ''گوکل کھیم جی'' کی لڑکی اِمی بائی سے اُن کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد کراچی واپس آ کر محمد علی جناح نے ''چرچ

مشن اسکول''، لارنس روڈ میں داخلہ لے لیا اور ''بمبئی یونی ورسٹی'' سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔ وہ بیرسٹری کے لیے 1893ء میں لندن گئے اور ''لنکن اِن یونیورسٹی، لندن'' میں داخلہ لیا۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ اِسی دوران اُن کی نوجوان ونئی بیاہتی بیوی اِمی بائی ہیضے کی وبا میں مبتلا ہوئیں اور بمبئی میں اسی بیماری سے انتقال کرگئیں۔ محمد علی جناح نے 1892ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1896ء میں لندن سے کراچی واپس آنے پر اُنہیں معلوم ہوا کہ اُن کی عدم موجودگی میں اُن کی والدہ محترمہ مٹھی بائی کا بھی انتقال ہو چکا ہے، جس کی خبر اُنہیں نہیں دی گئی تھی۔

وہ افسردہ دل اور پژمردہ طبیعت کے ساتھ وکالت کے لیے بمبئی چلے گئے اور ''بمبئی ہائی کورٹ'' میں اپنا نام رجسٹرڈ کروالیا۔ 1897ء میں محمد علی جناح کے والدِ گرامی جناب جناح پونجا انتقال کر گئے۔ اِن نامساعد حالات میں بھی محمد علی جناح نہیں گھبرائے اور نہ ہی اُنہوں نے کبھی حوصلہ ہارا۔ وکالت کے دوران بمبئی کے قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل 'میکفرسن'' نے اُنہیں وکلا کے چیمبر میں مطالعے کی اجازت دے دی۔ محمد علی جناح نے 1900ء میں چھ ماہ تک ''پریذیڈنسی مجسٹریٹ'' کے عہدے پر کام کیا۔ نومبر 1900ء میں اُنہیں ''مجسٹریٹ'' کے طور پر مستقل نوکری کی پیش کش کی گئی لیکن اُنہوں نے ''سرچارلس اولیونٹ'' کی یہ پیش کش قبول نہ کی اور اِس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے بمبئی کے وسط میں ایک عمارت میں اپنا دفتر قائم کیا اور وکالت کا آغاز کردیا۔ 1904ء سے اُنہوں نے وکیل کی حیثیت سے بے پناہ کامیابیاں حاصل کیں۔ اِسی سبب سے ''کانگریس'' کے راہ نما اُن کے قریب آئے تو اُن سے ربط ضبط بڑھنے لگا۔ ابھی تک محمد علی جناح عملی سیاست سے علاحدہ رہے تھے۔ یہ سن 1905ء کی بات ہے جب محمد علی جناح سیاسی معاملات میں دل چسپی لینے اور کُھل کر اظہار کرنے لگے۔ لیکن وہ کسی سیاسی تحریک یا سیاسی جماعت کی حمایت نہیں کرتے تھے نہ اُن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ دسمبر 1906ء میں پہلی بار کانگریس کے اجلاس میں ''دادابھائی نوروجی'' کے ''سیکریٹری'' کی حیثیت سے شرکت کی۔ یہ اجلاس ''کلکتہ'' میں منعقد ہوا تھا۔ محمد علی جناح نے بڑی تیزی سے کانگریسی حلقوں میں مقبولیت حاصل کی۔ 1907ء میں کانگریس میں ''سودیشی تحریک'' پر اختلاف پیدا ہوئے تو جناح نے ''گوپال کرشنا گوکھلے'' کے ''اعتدال پسند گروپ'' کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ 1908ء میں

اُنہوں نے کانگریس کے دستور وآئین کی اصلاح اور تبدیلی میں نمایاں حصہ لیا۔ اِس عرصے میں وہ دادا بھائی نوروجی کے سیکریٹری کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ ''منٹو مارلے اصلاحات'' کے نافذ کے بعد محمد علی جناح کو حکومت کے معاملات میں دخل اندازی کا پہلا موقع 1909ء میں ملا۔ دسمبر 1909ء میں ''بمبئی پریذیڈنسی'' سے ''سپریم امپیریل Legeslative کونسل'' کے لیے مسلمانوں کی ایک نشست پر محمد علی جناح بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ 25/جنوری 1910ء کو سپریم امپیریل Legeslative کونسل کے افتتاحی اجلاس میں وہ ایک فعال کارکن اور متاثر کن مقرر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ یہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ 7/مارچ 1911ء کو کونسل کے اجلاس میں ''مسلم اوقاف'' اور ''وقف علی الاولاد'' کو قانونی حیثیت دینے کے بارے میں بل کا مسودہ پیش کیا۔ مسلمان اور ہندو راہ نماؤں کی ''اتحاد کانفرنس'' میں محمد علی جناح بھی شامل ہوئے۔ یہ کانفرنس ''الہ آباد'' میں منعقد ہوئی تھی۔ 1912ء میں اُنہوں نے سپریم امپیریل Legeslative کونسل کے مباحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دسمبر 1912ء میں ''مسلم لیگ'' کی کونسل کا جو اجلاس ''بانکی پور'' میں ہوا اس میں پہلی بار شرکت کی اور مسلم لیگ کے آئین میں مجوزہ تبدیلیوں کی حمایت کی تاکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے مقاصد میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ سابقہ کارکردگی کی بنا پر ''وائس رائے'' نے محمد علی جناح کو 1913ء میں کونسل کا دوبارہ رکن نامزد کر دیا۔ اُنہوں نے مسلم اوقاف اور وقف علی الاولاد کے قانون کا مسودہ منظور کرایا اور سال کے شروع میں وہ چھٹیاں گزارنے لندن گئے۔

وہاں ''انڈین ایسوسی ایشن'' کی تنظیمِ نو کی اور وہاں سے واپسی پر مسلم لیگ کی رکنیت قبول کی۔ آگرہ میں 31 دسمبر 1913ء کو مسلم لیگ کے ساتویں اجلاس میں شریک ہوئے اور تقریر کی۔ مئی 1914ء میں کانگریس کے وفد کے قائد کی حیثیت سے ''انگلستان'' گئے۔ وطن واپسی کے بعد ایک بار پھر ''مسلم، ہندو اتحاد'' کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ محمد علی جناح کی کوششوں سے دسمبر 1915ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے بمبئی میں اجلاس ہوئے اور 31 دسمبر کو دونوں جماعتوں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ محمد علی جناح مسلم، ہندو اتحاد کے لیے تن دہی سے کام کرتے رہے۔ اکتوبر 1916ء میں ''احمد پور'' میں ہونے والی سولہویں ''بمبئی پراونشل کانفرنس'' کی

صدارت کرتے ہوئے محمد علی جناح نے نہایت مدبرانہ تقریر کی۔ دسمبر 1916ء میں مسلم لیگ کا نواں اجلاس ''لکھنؤ'' میں محمد علی جناح کی صدارت میں منعقد ہوا۔

یہاں وہ تجویز منظور ہوئی جو تاریخ میں ''میثاق لکھنؤ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اُنہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس کی صدارت بھی کی۔ 15/جون 1917ء کو اُنہوں نے ''ہوم رول لیگ'' میں شرکت کا اعلان کیا اور اُس کے صدر منتخب ہوئے۔ 28/جولائی 1917ء کو مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس (جو ''بمبئی'' میں منعقد ہوا تھا) میں ایک وفد ''انگلستان'' بھیجنے کا فیصلہ ہوا جس میں محمد علی جناح بھی تھے۔ یہ وفد ستمبر 1917ء میں انگلستان گیا تھا۔ 3/جولائی 1917ء کو محمد علی جناح کی صدارت میں بمبئی میں ایک جلسہ ہوا جس میں اُنہوں نے حکومت کے رویے پر سخت نکتہ چینی کی۔

19/اپریل 1918ء کو اُنہوں نے ایک ''پارسی سر ڈنشا پے ٹٹ'' کی صاحب زادی ''رتن بائی'' کے قبولِ اسلام کے بعد اُن سے شادی کر لی۔ 10/جون 1918ء کو بمبئی کے ''ٹاؤن ہال'' میں ''صوبائی کونسل'' کا اجلاس ہوا جس میں بمبئی کے گورنر ''لارڈ ولنگڈن'' نے جناح کا نام لیے بغیر اُن پر تنقید کی۔ کونسل کے اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو محمد علی جناح نے گورنر کی تقریر کا منہ توڑ جواب دیا اور تقریر کے بعد اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے۔ 16/جون 1918ء کو ''یومِ ہوم رول'' میں بھی اُنہوں نے گورنر بمبئی کے رویے کی شدید مذمت کی اور اُس کی رہی سہی عزت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ 11/ستمبر 1918ء کو طاغوتی طاقتوں کے خلاف اُس دور کا سب سے زبردست اور پُر امن مظاہرہ ہوا جو محمد علی جناح کی بلند حوصلگی اور بے باک قیادت کا مظاہرہ تھا۔

15/اگست 1919ء کو ''رتن بائی'' نے جناح کی خوب صورت بچی کو جنم دیا۔ 6/فروری 1919ء کو ''رولٹ کمیٹی'' کی سفارشات پر مبنی ایک بل سپریم امپیریل Legeslative کونسل میں پیش ہوا جسے محمد علی جناح نے شہری آزادیوں پر ڈاکا ڈالنے کے مترادف قرار دیا اور اُس کی سخت مخالفت کی۔ کونسل میں یہ بل منظور ہو گیا تو اُنہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ 13/اپریل 1919ء کو ''جلیانوالہ باغ'' میں جلسے پر گولیاں چلائی گئیں جن سے سرکاری رپورٹ کے مطابق 379/افراد ہلاک اور 1200 شدید زخمی ہوئے اور 15/اپریل 1919ء کو پنجاب بھر میں

مارشل لا لگا دیا گیا۔ محمد علی جناح اِس صورتِ حال کا ذمے دار ''گاندھی'' کو سمجھتے تھے اِس لیے وہ اِس مرحلے پر خاموش رہے۔ اِسی سال وہ مسلم لیگ کے ایک وفد میں شامل ہو کر انگلستان گئے اور ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ'' کے خلاف بڑی مؤثر تقریریں کیں۔ 1920ء میں ''خلافت'' کے بچاؤ کے لیے ہنگامے ہوئے تو محمد علی جناح نے کوئی دل چسپی نہیں لی۔ وہ اپنی بیوی اور بچی کے ہم راہ سیر و تفریح کی غرض سے لندن چلے گئے۔ ستمبر 1920ء کے آغاز میں وہ ہندوستان واپس آئے اور کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ اُنھوں نے ''تحریکِ ترکِ موالات'' کی حمایت کی اپیل نہیں کی۔ 3/اکتوبر 1920ء کو ''ہوم رول لیگ'' کا اجلاس گاندھی جی کی صدارت میں ہوا، اور آئین میں تبدیلی کر دی گئی جس پر احتجاج کرتے ہوئے محمد علی جناح 25/اکتوبر 1920ء کو اپنے 19 ساتھیوں سمیت مستعفی ہو گئے۔ دسمبر 1920ء کے آخری عشرے میں'' ناگ پور'' میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس میں گاندھی نے ''سوراج'' کے حصول کی قرارداد پیش کی تو محمد علی جناح نے مخالفت کی۔

19/فروری 1921ء کو گوکھلے کی چھٹی برسی پر تقریر کرتے ہوئے تحریکِ ترکِ موالات کے حوالے سے گاندھی کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ وہ ملک کو غلط راستے پر ڈال رہے ہیں۔ حکومت نے تحریکِ ترکِ موالات کے مخالف راہ نماؤں کی ہم دردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی تو جناح نے نہایت سختی سے اُسے مسترد کر دیا۔ 1922ء کو محمد علی جناح نے خاموشی سے بدلتے ہوئے حالات اور گاندھی کی سیاست کا جائزہ لیتے ہوئے اور زیادہ تر وقت وکالت میں صرف کر کے گزار دیا۔ اُنھوں نے کونسلوں کے انتخابات میں ایک آزاد رکن کی حیثیت سے حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ 1923ء میں اُن کے مخالف اُمیدوار مقابلے سے دست بردار ہو گئے اور 14/نومبر 1923ء کو بلا مقابلہ ''قانون ساز اسمبلی'' کے رکن منتخب ہو گئے۔

24/مئی 1924ء کو لاہور کے ''گلوب تھیٹر'' میں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا پندرہواں ملتوی شدہ اجلاس محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا۔ اُنھوں نے ایک مدبر سیاست دان کی حیثیت سے برصغیر کی سیاسی صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا۔ 16/ستمبر کو ایک تحریک پر تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے اسمبلی میں حکومت پر سخت تنقید کی۔ نومبر 1924ء میں بمبئی میں ایک ''اتحاد

کانفرنس'' ہوئی جس کے انعقاد میں محمد علی جناح نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 25/جنوری 1925ء میں اتحاد کانفرنس کی تشکیل کردہ ''تحقیقاتی کمیٹی'' کی ''سب کمیٹی'' کے اجلاس میں محمد علی جناح نے فرقہ وارانہ کشیدگی اور اختلافات کے موضوع پر مدبرانہ تقریر کر کے ہندوؤں کی سیاسی چالوں کو ناکارہ کر دیا۔ اسمبلی میں اُن کی بے لاگ تقریروں نے کھلبلی مچا دی۔

1926ء میں اُن کا رویہ اسمبلی میں حکومت کے ساتھ بڑا تلخ رہا اور وہ نہایت بے باکی سے حکومت کی کارکردگی پر معترض رہے۔ وہ ملک کی آزادی کے شوق میں ہندو اور مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہے لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس (جو دہلی میں منعقد ہوا تھا)۔ میں اُنہیں صاف کہنا پڑا کہ صرف مخلوط انتخاب سے قومیت پیدا نہیں ہو سکتی، اِس اجلاس میں اُنہوں نے ہندوستان کے آئین میں ترامیم تجویز کیں اور اُن کی تشریح میں پہلی بار ہندوؤں کے رویے کو مخالفانہ قرار دیا۔ 20/مارچ 1927ء کو اُنہوں نے ہندوستان کے 30/سربرآوردہ مسلمان راہ نماؤں کو ''دہلی'' میں مدعو کیا اور مسلمانوں کے مطالبات پر مشتمل ایک قرارداد پیش کی جسے بعد میں ''تجاویزِ دہلی'' کے نام سے مقبولیت حال ہوئی۔ 15/مئی 1927ء کو کانگریس کے اجلاس (جو بمبئی میں منعقد ہوا تھا) میں تجاویزِ دہلی کو من وعن منظور کر لیا گیا۔ 19/نومبر 1927ء کو اُنہوں نے بمبئی میں ''سائمن کمیشن'' کے خلاف ایک جلسۂ عام کیا جس میں ایک پُرزور خطاب کیا۔ سائمن کمیشن کے خلاف یہ پہلا جلسۂ عام تھا۔

16/فروری 1928ء کو محمد علی جناح نے Legeslative اسمبلی میں واضح طور پر اعلان کیا کہ اگر حکومت ہمارے مؤقف کو سمجھنے پر تیار نہیں ہے تو ہمیں بھی اختیار ہے کہ اُس سے تعاون کریں یا نہ کریں۔ اُنہوں نے ایوان میں اور ایوان سے باہر سائمن کمیشن اور ''اسکن کمیٹی'' کی سفارشات پر تقریریں کیں۔ 5/مئی 1928ء کو وہ لندن روانہ ہوئے۔ اِس دوران اُن کی ازدواجی زندگی کشیدگی کا شکار ہو چکی تھی۔ 31/دسمبر 1928ء کو کلکتہ میں ''کل جماعتی کنونشن'' میں اُنہوں نے ''نہرو رپورٹ'' پر نکتہ چینی کرتے ہوئے تین ترامیم پیش کیں۔ 1929ء کو محمد علی جناح کی اہلیہ رتن بائی کا انتقال ہو گیا اور اِسی سال 30/مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس دہلی کے ''روشن تھیٹر'' میں ہوا۔ صدارت محمد علی جناح نے کی۔ متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی

جس میں محمد علی جناح کے ''چودہ نکات'' کو اپنالیا گیا اور کہا گیا کہ جب تک یہ چودہ نکات منظور نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک مسلمانوں کے لیے کوئی دستور قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اِسی سال محمد علی جناح ''غازی علم الدین (شہید)'' کے مقدمے کی پیروی کے لیے ''لاہور'' گئے۔ مرکزی اسمبلی میں ''پنڈت موتی لال'' سے اُن کی جھڑپ ہوئی۔ 1930ء میں اُنہوں نے کانگریس کی ''سول نافرمانی کی تحریک'' کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے ''گول میز کانفرنس'' میں شرکت کی اور انگلستان میں سکونت اختیار کرلی۔ 2/مارچ 1931ء کو اُنہوں نے لندن سے ایک مسلم سیاست دان'' چودھری عبدالمتین'' کے نام ایک خط میں لکھا۔ '' مسلمانوں کو اپنی صلاحیتوں اور جدوجہد کے سہارے زندہ رہنا ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے اب صرف ایک راستہ رہ گیا ہے کہ وہ متحد ہوکر چودہ مطالبات کی تائید کریں اور کسی کے آلۂ کار نہ بنیں۔ جولائی 1933ء میں ''نواب زادہ لیاقت علی خاں'' نے اُنہیں وطن واپسی پر نیم رضامند کرلیا۔ اپریل 1934ء میں وہ ہندوستان آ گئے۔ اِسی ماہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی صدارت کی۔ بمبئی کے مسلمانوں نے جناح سے اپنی روایتی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں بلا مقابلہ منتخب کرایا۔

1935ء میں کانگریس کے صدر ''مسٹر راجندر پرشاد'' سے مل کر ہندو اور مسلم اختلافات دور کرنے کی ایک اور بھرپور کوشش کی۔ ''قانونِ ہند'' 1935ء کے تحت ''صوبائی اسمبلی'' کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ 1936ء میں ہوا۔ محمد علی جناح نے ''متحدہ ہندوستان'' کا طوفانی دورہ کیا۔ نتیجے میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ 15/اکتوبر 1937ء کو مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس کی صدارت کی جو ''لکھنو'' میں منعقد ہوا تھا۔ دسمبر 1937ء میں ''آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' کلکتہ کے پہلے اجلاس کی صدارت کی۔ ''مسٹر گاندھی'' سے خط و کتابت کی۔ 1938ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات کے متعلق ''پنڈت جواہر لال نہرو'' سے خط کتابت کی۔ اپریل 1938ء میں مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ اکتوبر 1938ء میں مسلم لیگ کانفرنس اور دسمبر 1938ء میں سالانہ اجلاس منعقدہ ''پٹنہ'' کی صدارت کی۔ گاندھی جی اور ''سوبھاش چندر بوس'' سے گفت وشنید کی۔ مارچ 1939ء میں ''قانونِ مال گزاری'' پر ''مرکزی قانون ساز مجلس'' میں تقریر کی۔ نومبر 1939ء میں وائس رائے ہند ''لارڈ لنلتھگو'' کی خواہش پر

ان سے ملاقات کی۔ مسٹر گاندھی کے ایک مضمون کا دندان شکن جواب دیا۔

23/ مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوا تھا کی صدارت کی اور ''قرارداد لاہور'' کی منظوری دی۔ دہلی اور ''احمد آباد'' کے طلبہ کی کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ 2/ مارچ 1941ء کو'' پنجاب اسٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے جلسے کی صدارت کی۔ 10/ مارچ 1941ء کو'' علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی'' کے طلبا سے خطاب کیا۔ پھر ''کان پور''،'' مدارس''، ''میسور''،'' ناگ پور'' اور مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اکتوبر 1941ء میں دہلی کے اُس اجلاس کی صدارت کی جس میں فیصلہ ہوا کہ وائس رائے ہند کی من مانی کارروائی کے پیشِ نظر مسلم لیگ اِس سال مرکزی اسمبلی میں شرکت نہیں کرے گی۔

1942ء میں برطانیہ سے ایک مشن آیا۔ محمد علی جناح نے مشن کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اگست 1942ء میں کانگریس کی قرارداد کی مخالفت کی۔ یہ وہ دور آ گیا تھا جب مسلم لیگ کی قیادت محمد علی جناح مکمل طور پر کرنے لگے تھے اور آپ کی سیاسی بصیرت اور خدمات وجدوجہد کی بنا پر پورا برصغیر اُنہیں قائداعظم محمد علی جناح کے نام سے پکارنے لگا تھا۔ 26/ جولائی 1943ء کو بمبئی میں ایک خاکسار نے قائداعظم پر ناکام قاتلانہ حملہ کیا۔ 18/ دسمبر 1943ء کو مشہور انگریز مصنف ''بیورلی نکلس'' نے قائداعظم سے ملاقات کی اور آپ کا طویل انٹرویو قلم بند کیا۔ 23/ دسمبر 1943ء کو کراچی میں اُن کے جلوس پر ہوائی جہاز کے ذریعے پھول برسائے گئے۔

1944ء میں قائداعظم نے ''راج گوپال اچاریہ'' کا فارمولا مسترد کر دیا۔ ''خضر وزارت'' سے مصالحت کی کوشش کی۔ 1945ء میں ''شملہ کانفرنس'' کی ناقابلِ قبول تجاویز مسترد کرنے کا اعلان کیا۔ بے پناہ مصروفیتوں کے باعث آپ کئی بار بیمار ہوئے مگر پھر بھی آرام نہ کیا اور مسلسل کام کرتے رہے۔ 1946ء میں قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ نے انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یہ انتخاباتِ ''نظریۂ پاکستان'' کی بنیاد پر لڑے گئے تھے۔ ''برطانوی وزارتی مشن'' کی تجاویز مسترد کر کے راست اقدام کا فیصلہ کیا گیا جس پر اکثر خطاب یافتہ مسلمانوں نے خطابات واپس کر دیئے۔ وائس رائے نے کانگریس کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی تو قائداعظم نے اِس عیاری اور مکاری پر شدید احتجاج کیا جس پر مسلم لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل کر لیا گیا۔

قائداعظم دسمبر 1946ء میں برطانوی حکومت کی دعوت پر لندن گئے، واپسی پر ''مفتیِ اعظم فلسطین سید امین الحسینی'' اور ''عزام پاشا'' سے ملاقات کی۔ 27/مارچ 1947ء کو ''میمن چیمبر آف کامرس بمبئی کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے معاشرتی عدل و انصاف اور مساوی بنیادوں پر قائم اقتصادی ڈھانچے کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے متعلق اس کے مخالفین کے پروپیگنڈے کی تغلیط کی کہ پاکستان چند روز بھی برقرار نہ رہ سکے گا۔ قائداعظم نے فرمایا: ''اِس لحاظ سے پاکستان کا کسی بحران سے دوچار ہونا غیر ممکن ہے۔ میں مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے لیے بہت سے منصوبوں پر غور کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں مسلم تاجروں کی بہتری کا سوائے اِس کے کوئی راستہ نہیں کہ وہ ہر ممکن طریقے سے اقتصادی تنظیم پیدا کریں۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے صنعتی اور تعلیمی ادارے کھولنے چاہییں۔ ہمیں اپنی قوم کی تنظیم کرنا ہوگی۔''

مارچ 1947ء میں ''لارڈ ماؤنٹ بیٹن'' گورنر جنرل اور وائس رائے کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور قائداعظم کے استقلال کے پیشِ نظر ''مطالبۂ قیامِ پاکستان'' ماننے پر مجبور ہوگئے۔ 30/جون 1947ء کو قیامِ پاکستان کا اعلان کیا گیا۔ قائداعظم نے بھی ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا اور آخر میں ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا۔ 11/اگست 1947ء کو پاکستان کی ''مجلسِ دستور ساز'' کا اجلاس ہوا جس پر قائد نے خطبۂ صدارت دیا۔ 14/اگست 1947ء کو ''پاکستان'' دنیا کے نقشے پر اُبھر آیا۔ 18/اگست 1947ء کو ''بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح'' نے پاکستان کے پہلے ''گورنر جنرل'' کی حیثیت سے قوم کے نام عید کا پیغام دیا۔

26/ستمبر 1947ء کو قائداعظم نے ''ولیکا ٹیکسٹائل ملز'' کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر پاکستان کو اپنی وسعت، اچھی آبادی اور اپنے وسائل کے مطابق دنیا میں کوئی شایانِ شان مقام حاصل کرنا ہے تو اُسے چاہیے کہ زراعت کے ساتھ ساتھ اپنے صنعتی رجحانات کو بھی فروغ دے اور اپنی اقتصادی زندگی میں صنعتی رجحانات پیدا کرے۔ سرِ دست پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ مصنوعات کے لیے باہر والوں کا محتاج ہے۔ اگر ہم اپنی مملکت کو صنعتی بنیادوں پر اُستوار کرنا شروع کر دیں گے تو نہ صرف اپنے ہزاروں باشندوں کو روزی مہیا کریں گے بلکہ اپنے وطن کے

وسائل میں بھی اضافہ کریں گے۔ صنعت و حرفت کے نام کی بہت سی خام اشیا ہمیں قدرت نے عطا کر رکھی ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ اِنہیں مملکت اور اِس کے باشندوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام میں لائیں۔"

30/اکتوبر 1947ء کو "پنجاب یونی ورسٹی گراؤنڈ"، لاہور میں قوم سے خطاب کیا اور مہاجرین کو صبر و ضبط کی تلقین فرمائی۔ 2/فروری 1948ء کو "بنگال آئل ملز" کا افتتاح کرتے ہوئے قائدِاعظم نے فرمایا: "ہر نئی مل اور کارخانہ ہمارے ملک کے اقتصادی استحکام اور عوام کی خوش حالی کی راہ میں ایک احسن قدم ہے۔"

اپریل 1948ء کو "میمن چیمبر آف کامرس" کے "سپاس نامے" کا جواب دیتے ہوئے قائدِاعظم محمد علی جناح نے صنعت اور زراعت کا ذکر فرمایا۔ "جنابِ صدر! آپ نے پاکستان کی صنعتی پالیسی کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ اِس قدر اہم مسئلہ ہے کہ اِسی پر تجار طبقے کے غور و خوض کی ضرورت ہے۔ حکومتِ پاکستان نے اپنے زیرِ اہتمام اسلحہ، گولہ بارود، ریل کے ڈبوں اور تار، وائرلیس کے آلات بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِس کے علاوہ تمام صنعتیں پرائیویٹ سرمائے کے لیے ہوں گی۔ پاکستان ایشیائی ممالک میں زرعی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان اپنی زرعی دولت سے فائدہ اُٹھا کر دنیائے تجارت کا علم بردار بھی بن جائے۔"

27/اپریل 1948ء کو اُنہوں نے "ایوانِ تجارت"، کراچی سے جو خطاب فرمایا اُس میں کہا: "تجارت اور کاروبار، قومی زندگی میں حیات بخش خون کے مانند ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک تاجروں کے بغیر پاکستان کا تصور اِسی طرح ناممکن ہے جیسے کاشت کاروں اور سرکاری ملازمین کے بغیر۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں تاجروں اور کاروباری لوگوں کو خوش آمدید کیا جائے گا اور یہ لوگ بھی اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ ہر شخص سے خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، ایمان داری کا برتاؤ کر کے اپنی معاشرتی ذمے داری کو فراموش نہیں کریں گے۔"

بابائے قوم قائدِاعظم محمد علی جناح نے یکم جولائی 1948ء کو "اسٹیٹ بینک آف پاکستان" کا افتتاح کیا۔ پاکستان کی پہلی سال گرہ پر 14/اگست 1948ء کو "جشنِ استقلال" منایا اور "زیارت" سے قوم کے نام پیغام بھیجا۔ جس میں فرمایا: "ہمارے دشمنوں کو یہ اُمید تھی کہ اُن کا دلی

منشا اقتصادی چال بازیوں سے پورا ہو جائے گا، ان تمام دلائل و براہین سے کام لے کر جو بغض و عداوت کی بنا پر تراشی جا سکتی ہیں پیش گوئیاں کی جانے لگیں کہ پاکستان دیوالیہ ہو جائے گا اور دشمن کی شمشیر و آتش جو مقصد حاصل نہ کر سکی۔ وہ اِس مملکت کی مالی تباہی سے حاصل ہو جائے گی مگر ہماری برائی چاہنے والے ان نجومیوں کی تمام پیش گوئیاں جھوٹی ثابت ہوئیں۔ ہماری تجارت کا توازن ہمارے حق میں ہے اور اقتصادی میدان میں بھی مجموعی حیثیت سے باقاعدہ ترقی ہو رہی ہے۔

اِسی سال قائدِاعظم محمد علی جناح نے پاکستانی قوم کو اخلاقیات، اسلامی اور ایمان داری کا درس دیتے ہوئے فرمایا: ''تجارت پیشہ افراد جائز کمائی کی اہمیّت کو کبھی فراموش نہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں تجار اور سوداگروں کا ہمیشہ خیر مقدم ہوگا اور وہ اپنی آمدنی کے ساتھ ساتھ مساوات اور جائز کمائی کبھی نہ بھولیں گے۔ پاکستان میں چند ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے حکومتِ پاکستان کو تشویش ہے اور وہ اِن میں کمی لانے کے طریقوں پر غور کر رہی ہے۔ پاکستان کی معاشیات اعلیٰ تجارت کے لیے ایک مؤثر آلہٗ کار ثابت ہوگی۔ میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان کے مال کی شہرت قائم کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان ہر ممکن کوشش کرے گی۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان دنیا میں اپنے مال کی خوبی اور عمدگی میں مستند ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی تجارت کاروباری دیانت کے اعلیٰ معیار قائم کرنے کا بہت مؤثر ذریعہ ثابت ہوگی۔ اگر ہم اپنے ملک کی چیزوں کا نام پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اِس کی ابتدا ابھی سے ہونی چاہیے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے اپنے کارخانے کا پلان تیار کرتے وقت کاری گروں کے لیے مناسب رہائشی مکانات اور دوسری آسائشوں کا خاص طور پر اہتمام کیا ہوگا کیوں کہ صنعت اُس وقت تک حقیقتاً فروغ پذیر نہیں ہو سکتی جب تک اُس کا مزدور مطمئن نہ ہوں۔

11 ر ستمبر 1948ء کو رات دس بج کر 45 منٹ پر ''کراچی'' میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ 12 ر دسمبر 1948ء کو لاکھوں انسانوں نے اُن کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی اور آپ کو آنسوؤں کی بارش میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ (اِنا للہ وانا الیہ راجعون)

◆◆◆

ہم اور قائدِ اعظم

محمود اختر خان

آج چہار جانب سے ایک ہی آواز سنائی دے رہی ہے کہ ملک کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ملک کے ہر شعبے میں نئے دن کے ساتھ تنزلی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔کیا ہم نے کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ آخر یہ سب عذاب ہمارے ہی لئے کیوں؟ حالانکہ ہمارے بعد آزادی حاصل کرنے والے بیشتر ممالک نے اس عرصے میں وہ مثالی ترقیاں کیں کہ زمانے کے لئے مثال بن گئے۔جیسے جاپان، چائنا۔

ہمارے نظام میں کہاں خرابی ہے اور اس کی اصلاح کس طرح ممکن ہے، اس کے لئے ہمیں اپنی موجودہ تاریخ کا اور اپنے قائد حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے فکری پیغامات کا بچشمِ غائر مطالعہ کرنا ہوگا، بات خود بخود واضح ہوجائے گی کہ ہم کیوں پیچھے جارہے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ:

> ''قائداعظم، ملتِ اسلامیہ کے اس آخری دور کے سب سے بڑے لیڈر تھے، انہوں نے ہمیں ایک تخیل دیا، ایک مقصد دیا، ایک منزل متعین کی، اور اُس منزل تک پہنچا بھی دیا۔ دنیا میں ایسے قائد بہت کم ہوئے ہیں کہ کسی مقصدِ جلیل کو لے کر اٹھیں اور اپنی زندگی میں اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئے ہوں، یہ سعادت قدرت نے قائداعظم ہی کی قسمت میں لکھی تھی۔''

تحریکِ آزادی کے عملی ساتھی، محبانِ پاکستان نے برملا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ تحریکِ پاکستان کے لئے قائدِاعظم نے جو تقریریں کیں، جو بیانات دیئے جو پریس کانفرنسیں کیں، ہر موقع پر مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی جو وضاحت کی، جو ترجمانی کی اُن کا باقاعدہ ریکارڈ مرتب نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد جبکہ قائدِاعظم کی حیثیت گورنر جنرل کی تھی ان کی تقاریر، ان کے بیانات، ان کے سوال و جواب کا سرکاری طور پر مستند ریکارڈ نہیں رکھا گیا۔ اس کا گلہ رئیس احمد جعفری نے ببانگِ دہل کیا ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میں نے جب ''خطباتِ قائدِاعظم'' کی تدوین و ترتیب کا کام شروع کیا تو کراچی میں حکومتِ پاکستان کے محکمۂ اطلاعات اور محکمۂ مطبوعات وغیرہ کے مسلسل چکر لگائے، افسرانِ متعلقہ سے شرف نیاز حاصل کیا، لیکن سب نے تہی دامنی کا اعتراف ندامت کے ساتھ فرمایا اور ایک صاحب نے تو یہ تک فرما دیا کہ ہمارے پاس قائدِاعظم کی تقریروں کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور اخبارات میں جو شائع ہوئی ہیں، انہیں سرکاری نقطۂ نظر سے ہم مستند تسلیم نہیں کرتے، یہاں بھی رئیس احمد جعفری صاحب کی شائستہ مزاجی کا معترف ہونا پڑے گا وہ ایک صاحب کہہ کر نکل گئے اگر وہ صاحب کا نام بھی تحریر فرما دیتے تو تاریخ میں ایک ملنگ کا ٹیکہ بھی اُن کے نام کے ساتھ ہوتا۔

ہمیں اُن کا مرہونِ منت ہونا چاہیے کہ انہوں نے صدرِ مملکت کو ایک تجویز دی کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ''قائدِاعظم اکیڈمی'' قائم کی جائے اور یہ درخواست بھی کی کہ اس اکیڈمی میں عظیم الشان کتب خانہ ہو، جو انگریزی اور اُردو کی بہترین سیاسی کتابوں پر مشتمل ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ اصحابِ قلم کی ایک جماعت ہو جو تحریکِ خلافت سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے تمام واقعات اپنے مشاہدات، تاثرات، تجربات اور نظریات کی روشنی میں قلم بند کرے تاکہ اس طرح مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں اور سیاسی زندگی سے متعلق، مستند، معتبر اور مفصل ذخیرہ فراہم ہو جائے، اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ ایک ''قائدِاعظم میوزیم'' بھی قائم کیا جائے جس میں نہ صرف قائدِاعظم کے خطوط اور تحریریں فراہم کی جائیں بلکہ ہر بڑے مسلمان لیڈر کے خطوط اور اس کی تحریریں جمع کی جائیں اور انہیں ترتیب و تہذیب کے بعد شائع کیا جائے۔

ان کی خواہش اور استدعا یہ بھی تھی کہ ''قائدِاعظم اکیڈمی'' اُن زعما کی سوانح عمریاں بھی

مرتب کرائے جنھوں نے مسلمانوں کو سر بلند کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کا یہ اظہار بھی تھا کہ اکیڈمی اُن لوگوں کی بھی ایک مکمل و مستند فہرست مرتب کرے جنھوں نے تحریکِ خلافت اور مسلم لیگ اور دوسری ملّی تحریکوں میں کارکردگی کے صلے میں جیل کی سزائیں بھگتی ہیں، جائیدادیں نیلام کی ہیں اور تباہی و بربادی کو لبیک کہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اتنے بڑے پیمانے پر حکومت ہی یہ کام انجام دے سکتی ہے، مملکتِ اسلامیہ میں سب سے بڑی ریاست اور دنیا کی بڑی حکومتوں میں ساتویں بڑی حکومت اس کام کو انجام دینے میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتی۔

ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے مختلف مقامات، کلکتہ، بمبئی، دہلی، لکھنؤ، الہٰ آباد، پٹنہ، لاہور، پشاور، کراچی اور دوسرے مقامات سے ابھی کافی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔ انہوں نے واضح طور پر تحریر فرمایا کہ اگر اس طرف توجہ نہ دی گئی تو یہ قیمتی اور گراں قدر سرمایہ، ضائع ہو جائے گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ بہت کچھ ضائع بھی ہو چکا ہے۔ انہوں نے آخری سطور میں یہ تحریر فرمایا کہ یہ میری ذاتی اپیل نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے دل کی آواز ہے، کیا میں امید کروں کہ اس پکار پر حکومت اور صدرِ مملکت توجہ فرمائیں گے؟

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

آج جس ''قائداعظم اکیڈمی'' میں فخر کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں وہ رئیس احمد جعفری کی کاوشوں اور نیک خواہشات کا ثمر ہے کہ جس نے ہمیں اس قابل رکھا ہے کہ آج بھی ہم اُس سے گزر کر اپنی اصلاح اور اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکتے ہیں، نسلِ نو کو آنے والے عذابوں سے محفوظ کر سکتے ہیں۔

ابھی تو بات تھی صرف ''قائداعظم اکیڈمی'' کی، قائداعظم پر بات کرنے کے لئے بہت وقت درکار ہے۔ یہ تو ابتدا ہے:

اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

☆......☆......☆

وہ فیصلے، وہ اقدام جن کے دوررس مثبت نتائج برآمد ہوں۔ اچھے سیاسی ذہنوں کو متحد کرتے ہیں۔ اپوزیشن اور مصنفین کے لئے تاریخی درس ہوتے ہیں کہ مصنف اپنے فیصلوں پر اس قدر غور و فکر کریں کہ وہ خود کو تاریخ کے سیاہ باب سے محفوظ کرلیں۔

ہمیں پاکستان کی موجودہ صورت پر تشویش ضرور ہے لیکن مایوسی قطعاً نہیں اس لئے تاریخ کے حوالے ضروری تصور کئے جا رہے ہیں، وہ ہمارے لئے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ 1913ء کی بات ہے جب مسٹر جناح بہت بڑے نیشنلسٹ اور کانگریسی تھے!

مسلم لیگ کا ساتواں اجلاس دسمبر 1913ء میں بمقام آگرہ منعقد ہوا۔ سر ابراہیم رحمت اللہ صدرِ اجلاس تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان ابھی تحریکِ آزادی سے آشنا نہیں ہوا تھا، گاندھی جی جنوبی افریقہ میں ہندوستان کے حقوق کے لئے لڑ رہے تھے، موتی لال الٰہ آباد میں وکالت کر رہے تھے، جواہر لال نہرو کو کوئی جانتا بھی نہ تھا، راجندر پرشاد، پٹیل، اور دوسرے زعما کا سیاسی وجود اب تک پردۂ عدم میں تھا۔ کانگریس کے سالانہ جلسوں میں دب دب کر ڈر ڈر کر انگریزوں سے کچھ حقوق مانگے جاتے تھے۔ لیکن محمد علی جناح اُس زمانے میں بھی نڈر، بے باک اور زبردست انقلابی تھے۔ مسلم لیگ کی سرکاری روداد میں درج ہے۔

> ''محمد علی جناح نے تجویز پیش کی کہ سیکریٹری آف اسٹیٹ کونسل میں حسبِ ذیل تبدیلیاں کی جائیں۔
>
> (الف) سیکریٹری کی تنخواہ انگریزی تخمینہ کے مطابق ہو۔
>
> (ب) کونسل کے نصف ممبر انتخاب کے ذریعہ مقرر ہوں۔
>
> (ج) نامزد ممبروں میں سے نصف غیر سرکاری ہوں۔
>
> (د) بقیہ نصف نامزد ممبر ایسے ہوں جو کم از کم دس سال تک ہندوستان میں ملازم رہ چکے ہوں۔
>
> (ک) بلحاظ اختیارات کونسل مشاورتی ہو نہ کہ انتظامی۔
>
> (غ) میعادِ عہدہ ۵ سال سے زیادہ نہ ہو۔

اس تجویز نے نہ صرف ہندوستان کے حصارِ سیاست میں جناح کی دھاک بٹھادی بلکہ برطانیہ کے ایوانِ شاہی میں بھی لوگ چوکنا ہوگئے کہ یہ من چلا سیاست دان کون ہے؟

31 ردسمبر 1925ء۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھتی جارہی تھی۔ ہندو مسلم فسادات روزمرہ کے واقعات بن گئے تھے، کانگریس نے سکوت اختیار کرلیا تھا۔ مجلسِ خلافت بے اثر ہوتی جارہی تھی، فرقہ پرستوں کی بن آئی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کا نام لینا اشتعال انگیزی کو دعوت دینا تھا۔ ان حالات میں لیگ کا سالانہ اجلاس سر عبدالرحیم کی صدارت میں ہوا (علی گڑھ میں)، جنابِ صدر نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس اجلاس میں مسٹر جناح نے بھی شرکت کی تھی۔ وہ اب تک مایوس نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب تک مشترک پروگرام کے حامی و داعی تھے۔ انہوں نے ایک تجویز پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> ''لازم ہے کہ پہلے ہم خود آپس میں کوئی فیصلہ کرلیں۔ حکومت سے ہمارا صرف یہی مطالبہ ہے کہ موجودہ آئین کی نظرِ ثانی کرتے ہوئے ایک قانون مرتب کرنے کے لئے کوئی ایسی اسکیم بنائی جائے جس میں ہندوستان کی ترقی کا خاص خیال رکھا گیا ہو۔''

ووٹنگ کے لئے جب اس تجویز کو پیش کیا گیا تو بہت بڑی تعداد کے ووٹ سے یہ پاس ہو گئی۔ لاکھ کوششوں کے باوجود یہ بات عیاں ہوگئی کہ متحدہ ہندوستان ہندو کی ایک چال ہے اور پھر حقوق کی پامالی مسلمانوں کا مقدر ہوگی۔

محمد علی جناح بد دل ہو کر لندن چلے گئے، 1928ء سے 1935ء تک، مگر قدرت کو تو مسلمانوں کو خطۂ آزادی سے نوازنا تھا۔ یہ قوم سے محبت کا جذبہ تھا کہ جناح قدردانوں کے اصرار پر واپس آگئے۔

1937ء قائد نے برطانوی جمہوریت کے خلاف پرچم جہاد بلند کیا۔

اب قائد اعظم نے مسلمانوں کے جداگانہ قوم ہونے کا اعلان کیا، یہی وہ دور ہے جب قائد اعظم نے مسلمانوں کو خود اعتمادی کا درس دیا۔

لکھنؤ کے تاریخی اجلاس کا خطبہ ٔ صدارت 15 /اکتوبر 1937ء مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں قائداعظم کا خطبہ!

''خواتین وحضرات!

آل انڈیا مسلم لیگ کی گزشتہ تیس سالہ زندگی میں یہ اجلاس بے حد اہم اور نہایت ضروری ہے۔ جس پروگرام اور پالیسی کی تشکیل کے لئے آپ کو دعوت دی گئی ہے اس پر ہی مسلمانانِ ہند اور ملک کے مستقبل کا انحصار ہے۔ مسلم لیگ نے اپنے اجلاس منعقدہ 12/اپریل 1936 کو اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ رابطہ عوام کی پالیسی اور پروگرام کو اختیار کیا تھا۔ لیگ نے رفتارِ زمانہ اور حالاتِ گردو پیش کا جائزہ لیتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1937ء کے مطابق صوبائی آئین کے انتخابات کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا، اگرچہ یہ آئین قطعی طور پر غیر تسلی بخش ہے۔ تاہم اس سے حتی الوسع بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں یہاں پر 12/اپریل 1932ء کی منظور شدہ قرارداد بجنسہ پیش کرتا ہوں۔

اس ملک میں آئینِ جدید کے مطابق جو پارلیمنٹری طرزِ حکومت رائج کیا جا رہا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے مطابق ایسی جماعتیں معرضِ وجود میں آ جائیں، جن کی پالیسی اور پروگرام معین ہو اور وہ حلقہ ہائے انتخاب کے سیاسی رجحانات کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے اور جماعتوں کے درمیان اغراض و مقاصد کے لیے تعاون پیدا کر کے دستورِ حکومت کو حتی الامکان ملک کے لئے مفید بنادے اور چونکہ مسلمانوں کی تقویت و استحکام صوبہ جاتی حکومتوں میں مناسب و مؤثر حصہ حاصل کرنے کے لئے اُن کی ایسی جماعتی وحدت ضروری ہے جو کسی ترقی پسندانہ پروگرام کی حامل ہو۔ لہٰذا ان خیالات کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ آنے والے صوبہ جاتی انتخابات میں انتہائی سرگرمی اور جدو جہد

کے ساتھ شرکت کی جائے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مسٹر جناح کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی صدارت میں ایک ایسا انتخابی بورڈ قائم کریں جس کے ممبروں کی تعداد 35 سے کم نہ ہو اور اُس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ مختلف صوبہ جات میں صوبہ جاتی انتخابی بورڈوں کی تشکیل کے ساتھ ہی مرکز کے ساتھ اُن کا الحاق بھی کر سکے اور ہر صوبے کے مخصوص حالات کے مطابق مندرجہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مناسب ذرائع اور وسائل تجویز کئے جائیں۔''

اس فیصلے کے بعد جون 1936ء میں مسلم لیگ کا ایک سینٹرل پارلیمنٹری بورڈ معرضِ وجود میں آ گیا اور لیگ کی قرارداد اور ہدایات کے مطابق صوبہ جات میں صوبہ جاتی بورڈ قائم ہو گئے لیکن کسی سابقہ تیاری اور موجودہ تنظیم کی عدم موجودگی کے باعث اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور بالخصوص ایسے حالات میں صوبہ جاتی انتخابات میں مقابلہ کرنا بھی بے حد دشوار تھا۔ جبکہ مسلمان بحیثیت تعداد اقلیت میں ہونے کے ساتھ ہی تعلیمی اعتبار سے بھی پسماندہ اور اقتصادی لحاظ سے بالکل ناکارہ اور نا قابلِ ذکر ہوں۔ اُن کی معاشرتی اور اقتصادی اصلاح پر کبھی توجہ نہ دی گئی ہو اور ہمارے مقابلے میں ایک ملک کی ہمسایہ اقوام ایک باقاعدہ پروگرام کے تحت تنظیم و ترقی کی بے شمار منازل طے کر چکی ہوں اور بالخصوص ہندو قوم اکثریت میں ہونے کے ساتھ ہی تربیت، ضبط، تعلیم، تجارت اور مالی اعتبار سے بہت آگے نکل چکی ہو:

''لیکن یہاں پر میں اس بات کا ذکر کر دینا نہایت ضروری خیال کرتا ہوں کہ انتخابات کے اختتام سے قبل چھ ماہ کا کام بہ اعتبارِ نتائج بے حد حوصلہ افزا ثابت ہوا، اس لئے ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، ان تمام صوبہ جات میں جہاں پارلیمنٹری بورڈ اور لیگی پارٹیاں بنائی گئی تھیں، وہاں پر کم و بیش ستر فیصد امیدوار کامیاب ہو گئے، اور انتخابات کے اختتام کے بعد میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ مدراس سے لے کر شمال مغربی سرحدی صوبے تک اب ہر صوبہ میں ڈسٹرکٹ لیگیں قائم ہو چکی

ہیں۔ گزشتہ اپریل سے مسلمانانِ ہند بہ تعداد کثیر لیگ کے گرد جمع ہو رہے ہیں اور مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جونہی وہ مسلم لیگ کی پالیسی او رپروگرام پر متفق ہوں گے ، اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے۔ مسلم لیگ ہندوستان کے لئے مکمل نیشنل ڈیموکریٹک سیلف گورنمنٹ (قومی جمہوری حکومت خود اختیاری) کی طلب گار ہے۔''

نادان و نافہم عوام کے لئے مختلف النوع ترکیبات مثلاً پورنا سوراج، حکومت خود اختیاری، مکمل آزادی، ذمہ دار حکومت، آزادی کا خلاصہ اور مستعمراتی درجہ وغیرہ کی اصلاحات استعمال کی جا رہی ہیں، بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو مکمل آزادی کا ذکر کر رہے ہیں لیکن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کو ہاتھ میں لے کر مکمل آزادی کا تذکرہ بیکار ہے جو لوگ زیادہ شدت کے ساتھ آزادی کا ذکر کر رہے ہیں، وہی فی الحقیقت اس سے نا آشنا ہیں۔ کیا گاندھی اردن معاہدہ مطالبہ مکمل آزادی کے مطابق تھا؟ کیا صوبہ جاتی آئین میں اُس پر عمل پیرا ہونے اور وزارتوں کو قبول کرنے سے قبل جو وعدے لئے جا رہے تھے وہ پورنا سوراج کے مطابق تھے؟ اور جب حکومت نے یہ یقین دلایا تو کیا عہدوں کو قبول کرنے اور راس صوبہ جاتی دستور پر عمل پیرا ہونے کی قرارداد جس کو حکومتِ برطانیہ تیار کر کے شاہی اقتدار کے بل پر اہلِ ہند پر مسلط کر دیا تھا کانگریس پارٹی کے پروگرام، پالیسی اور اعلان کے مطابق تھا؟ کیا آئین کو تباہ کرنے کا مطلب اس پر عمل پیرا ہونا ہے؟ اس قسم کے کاغذی اعلانات نعرے اور دعویٰ ہمیں کہیں بھی نہ لے جائیں گے۔ ہندوستان کے لئے ایک کامل متحدہ محاذ اور دیانت دارانہ محنت کی ضرورت ہے اور اس کے بعد جب عوام کی حکومت عوام کے ذریعہ سے اور عوام کے لئے ہوگی تو اس کے نام کے متعلق ہمیں چنداں متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ نام خواہ کچھ بھی ہو ہمیں کسی ایسے ہی نظامِ حکومت کی ضرورت ہے۔

☆......☆......☆

پاکستان میں رہنے والوں کو پاکستان پر حکومت کرنے والوں کو اُس تاریخ سے ضرور گزرنا چاہیے کہ پاکستان کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اور اُسے کس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ اس امر کا سنجیدہ مطالعہ ہمارے بہت سے مسائل کا حل بھی ہے اور پاکستان کا تابناک مستقبل بھی۔

1938ء میں پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس قائداعظم کی صدارت میں بڑی شان و شوکت اور بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوا۔ جس کے صدرِ مجلس استقبالیہ عزیزِ ملت سیٹھ عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لاء تھے۔ آپ متحدہ ہندوستان کی چند ہستیوں میں سے ایک تھے جن کا اخلاص مثالی تھا، دیانت آپ کی فطرت میں قدرت نے ودیعت کی تھی۔ جو جذبہ ملّی و قومی سے اس قدر سرشار تھے کہ دوست تو دوست دشمن بھی آپ کے جذبے کے معترف تھے۔ وہ ایک وسیع القلب انسان تھے، ان کی شرافت، عالی ظرفی کا سب کو اعتراف تھا، پٹنہ کے چوٹی کے بیرسٹروں میں آپ کا شمار تھا۔ ان کی قابلیت اور ذہانت کی بدولت ان کے موکلوں میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو شامل تھے۔ اُس وقت کے اعتبار سے آپ کی آمدنی لاکھوں میں تھی۔ یہ ساری رقم ملک و قوم اور ضرورت منداشخاص پر صرف کرتے تھے۔ قناعت پسندی کا عالم یہ تھا کہ کل کی پروا کبھی نہ کی، ملّی خدمت کا جنوں اس حد تک کہ آپ نے شادی بھی نہیں کی۔

آپ کو عزیزِ ملت کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جب آپ نے خطبۂ استقبالیہ سچے جذبے، ملّی عزائم سے بے باکانہ انداز میں ارشاد فرمایا تو آپ نے مسلمانانِ ہند کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> "ہندوستان کے بدقسمت مسلمان مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد حیران و پریشان تھے، اُن کے چہرے پژمردہ، ان کی جبینیں غم آلودہ اور ان کی آنکھیں عرصہ تک ڈبڈبائی ہوئی رہیں۔ پہلے یہ انگریزوں سے مرعوب یا متنفر ہو کر بہت سی تحریکوں سے علیحدہ رہے، اور کوئی عملی قدم اپنی اصلاح و ترقی کے لئے نہیں اٹھایا مگر کچھ عرصے بعد زمانے کے تغیرات کو محسوس کر کے انہوں نے بھی جدوجہد شروع کی، 1916ء میں مسلم لیگ نے کانگریس کے دوش بدوش آزادیِ ہندوستان کا مطالبہ کیا اور برادرانِ وطن کے ساتھ باہمی سمجھوتہ کر کے اُس کے حصول کی طرف متوجہ ہوئی۔ مسلمانوں نے اس امر کو ہمیشہ محسوس کیا کہ آزادیِ ملک کے لئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے (پہلی) جنگِ عظیم سے پہلے اور اُس کے بعد ہندوستان میں آزادی کی جو تحریکیں اٹھیں ان میں مسلمان آگے آگے رہے۔

ان مسلمانوں نے جلیانوالہ باغ میں گولیاں کھائیں، پنجاب کے مارشل لا میں سخت سے سخت سزائیں بھگتیں، نیز خلافت اور سوراج کی متحدہ تحریک میں ہزاروں کی تعداد میں جیل خانہ گئے۔

سچ تو یہ ہے کہ 21-1920 کی تحریکیں مسلمانوں ہی کی مرہونِ احسان ہیں لیکن ملک کی بدقسمتی سے 1918ء میں نہرو رپورٹ نے متحدہ قومیت کی بنیاد کو ہلا ڈالا، ہندو مسلم اتحاد کے لئے یہ نقطۂ انحراف ثابت ہوا۔ اس رپورٹ نے کانگریسی ذہنیت کو بے نقاب کر دیا، ان ہی وجوہ سے مولانا محمد علی جوہر نے بھی اس کی شدید مخالفت کی اور ان کی ہم نوائی میں سارے ہندوستان نے بھی صدائے احتجاج بلند کی۔ اس رپورٹ سے مسلمانوں کو یہ خطرہ بلکہ یقین ہوا کہ کانگریس ایک دہری حکومت ہندوستان میں قائم کرنا چاہتی ہے جس میں انگریزوں کے فوجی اور خارجی اختیارات تو برقرار رہیں گے لیکن ملکی اور انتظامی اختیارات کانگریس کے ہاتھوں میں آجائیں گے اور غریب مسلمان دہرا غلام بن جائے گا۔ جب مسلم زعما کو کانگریس کے مشکوک رویہ کا یقین ہو گیا تو کلکتہ کنونشن کے موقع پر جب قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر نے مسلمانوں کی طرف سے اس رپورٹ میں کچھ ترمیموں کی خواہش ظاہر کی تو ہندو رہنماؤں نے اُن کے مطالبے کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔"

آگے چل کر عزیزِ ملت نے سیاسیاتِ ہند کا جائزہ لیتے ہوئے اور کانگریس کے نعرۂ قومیت متحدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"مسلمان متحدہ قومیت کی تحریک کے صرف اس پہلو کو تسلیم کر سکتا ہے جو ملک کے لئے آزادی اور اختیارات حاصل کرنے میں مددگار اور ہندوستان کے معاشی مسائل کے حل کرنے میں معاون ہو لیکن وہ اسے کسی طرح قبول نہیں کر سکتا کہ اپنی قومی انفرادیت کو ہندوستان کی متحدہ

قومیت میں مدغم کردے۔"

پاکستان کا تخیل ذہن، دماغ میں گردش کر رہا تھا اور ایک سال بعد یہ تخیل مسلمانانِ ہند کا نصب العین بننے والا تھا لیکن ابھی تک اس تخیل کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی، اب تک قائد اعظم اور مسلمانانِ ہند اس بات کے جویا تھے کہ متحدہ ہندوستان میں اُن کے حقوق محفوظ ہو جائیں۔

عزیزِ ملت نے فرمایا:

"مسلم لیگ کا نصب العین خوامخواہ کسی کی مخالفت پر مبنی نہیں ہے۔ مسلم لیگ اس نوع کے سیاسی ومعاشی پروگرام کا ساتھ دے گی جس کے اصول اسلامیانِ ہند اور دوسری قوموں کے لئے مفید ہوں، وہ کاشت کاروں کو، زمین داروں کی زیادتی اور ناانصافی سے پریشان اور بدحال نہ ہونے دے گی اور ناقابلِ عمل وعدوں سے اُن کو خوش کر کے پھر انہیں مایوس نہ کرے گی۔"

مسلم لیگ یہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی، بشرطیکہ کانگریس ان کی جائز شکایات رفع کر دیتی۔

اپنے اس خطبے میں عزیزِ ملت نے فرمایا:

"یوں تو مسلمانوں کی عام شکایات کی ایک طویل فہرست ہے جس کا تذکرہ یہاں ناممکن ہے پھر بھی بعض ایسے اہم مسائل ہیں جو کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔

ودیا مندر اسکیم، مسلمان بچوں کی تعلیم کے لئے بالکل ناموزوں ہے، اس کے نام ہی میں فرقہ وارانہ ذہنیت پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ اسکیم جبراً کانگریسی حکومتوں نے عمومی طور پر اور سی پی کی حکومت نے خصوصی طور پر نافذ کردی۔"

سید صاحب نے کہا:

"سی پی صوبہ متوسط کے وزیر اعظم مسٹر شکلا کے ایک بیان کے مطابق بھی لفظ مندر قصداً ایک غرض سے ابتدائی تعلیم گاہوں کے لئے

اختیار کیا گیا ہے تا کہ اس لفظ سے ہندو بچوں کے مذہبی جذبات میں جوش پیدا ہو، حالانکہ سرکاری درسگاہ میں تعلیم پانے کے مستحق صرف ایک ہی قوم کے افراد نہیں ہوتے، بلکہ مسلمان او ر دیگر غیر ہندو بھی ہوتے ہیں، مشترکہ تعلیم گاہوں میں اس طرح کا نام اختیار کرنے اور رواج دینے کی مطلق گنجائش نہیں تھی، یہ بالکل ناقص، ناممکن او ر بعض حیثیتوں سے قدامت پرستانہ اور دقیانوسی اسکیم ہے اور مسلمان بچوں کے قومی مزاج کے صریحاً خلاف اور مضر ہے۔

بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دے کر مسلمانوں کو صدمہ اور رنج پہنچایا گیا ہے۔اس نغمے میں بت پرستی کا تخیل ہے اور اس کی تصنیف مسلمانوں سے منافرت پر مبنی ہے۔ایسی صورت میں کسی مشترکہ جلسہ یا تعلیم گاہوں میں اس ترانے کو جاری کرنے یا اس کی نغمہ سرائی پر اصرار کرنا مسلمانوں کو دکھ دینا اور برہم کرنا ہے، اُردو ہندی کا قضیہ بھی نہایت ہی تلخ اور مضر صورت اختیار کر رہا ہے، اُردو جو ہندو اور مسلمانوں کی کوششوں کی زندہ یادگار ہے۔ کچھ عرصے سے سیاسی اختلافات کی وجہ سے تعصب کا شکار ہو رہی ہے اور آج کانگریس وزارتوں میں حکمرانہ اقتدار کے ماتحت مٹائی جارہی ہے۔

☆......☆......☆

رئیس احمد جعفری قائداعظم کے ساتھی اور مسلمانوں کے وکیل بن کر مسلم قوم کو تاریخ میں سرخرو کرانے میں پوری طرح کامیاب ہیں کہ مسلم رہنماؤں نے اپنی پوری کوشش کی مسلم لیگ اور کانگریس مشترکہ جدوجہد سے فرنگی زنجیروں سے آزدی حاصل کریں۔علیحدہ مملکت کے تصور کے لئے کانگریس کے رویوں نے مجبور کیا۔جیسا کہ بات ہو رہی تھی بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دینا۔ اُردو جس کا شمار آج دنیا کی تیسری زیادہ بولی جانے والی زبانوں میں ہوتا ہے، اُس وقت بھی بقول رئیس احمد جعفری کے: اُردو ہمہ گیر حیثیت اور عام مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ برما کے دشوار گزار

جنگلوں میں اُردو اسکول قائم ہیں۔ سرحد کا پٹھان، سندھ کا کاشتکار، بمبئی کا تاجر اور بنگلور کا بساطی بھی اُردو جانتا، سمجھتا، بولتا اور لکھتا تھا۔ غرض یہ کہ ہندوستان کے ہر قصبے میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس لحاظ سے یہ زبان نہ صرف صوبائی خلیجوں کو پاٹ کر بلکہ سمندر اور پہاڑ عبور کر کے ایک ہمہ گیر حیثیت حاصل کر چکی تھی جو ہندی زبان کے نصیب میں نہیں تھی۔ اُردو ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہندوؤں نے بھی اس زبان کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔ اُس وقت کے ماضی کو اگر صرفِ نظر کر بھی دیا جائے تو اُس دور میں سر تیج بہادر سپرو، منشی دیا، نارائن نگم، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور ڈاکٹر تاراچند کی زریں خدمات اُردو ادب کے حوالے سے ناقابلِ فراموش تھیں، خود اُس صوبے کے فاضل اور علم دوست ڈاکٹر سچائند سہنا (وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی) نے جن کی سخن فہمی اور اُردو دانی کا ہر شخص معترف ہے اسی دوران جب ان کے لڑکے کی شادی کی تقریب تھی تو انہوں نے جو دعوت نامے تقسیم کئے تھے وہ اُردو زبان میں تھے، یہ دعوت نامہ اُردو زبان اور رسم الخط سے تعصب برتنے اور بیر رکھنے والوں کے لئے ایک سبق ہے۔ رقعہ کی عبارت حسبِ ذیل ہے:

> ''بفضلِ خدا میرے نورِ نظر رادھا کرشن سلمہٗ کی برات کی بتاریخ ۱۷ر جنوری ۱۹۱۹ء، شام کے تین بجے میرے مکان سے آنریبل جسٹس سکھ دیو پرشاد ورما کی کوٹھی پر جائے گی اور بعد واپسی برات اُسی رات آٹھ بجے غریب خانہ پر دعوتِ طعام ہے، امید ہے کہ سب احباب تقریب اور کھانے میں شرکت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

الملتمس سچانند سنہا۔''

یہ حوالہ اس بات کی دلیل ہے کہ اُس پُر آشوب دور میں بھی اُس دور کے ہندو دانشور اُردو سے کتنا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان حالات میں اُردو مخالفت اور بندے ماترم جیسے ترانے کا اطلاق اُن مخصوص ذہنوں کی پیداوار ہو سکتا ہے جو اُردو سے یا اُردو بولنے والوں سے خدا واسطے کا بیر رکھتے تھے۔

اس بات کو معتبر قرار دینے کے لئے رئیس احمد جعفری کی بدولت ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو یومِ اُردو کے جلسے کے موقعے پر الٰہ آباد میں کی گئی سر تیج بہادر سپرو کی صدارتی تقریر ملاحظہ ہو، انہوں

نے فرمایا:

''اُردو ہم ہندو اور مسلمانوں کی وراثتِ مشترکہ نا قابلِ تقسیم ہے، یہ ہمارے اتحاد کی سب سے بڑی یادگار ہے، ہم کئی صدیوں سے یہ زبان بولتے چلے آئے ہیں۔ میرے باپ دادا، میرے بچے سب یہی زبان بولتے ہیں اور کسی حال میں بھی اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ جو لوگ اس میں غیر مانوس ثقیل سنسکرت اور عربی الفاظ خوامخواہ داخل کرتے ہیں، وہ زبان کو خوامخواہ خراب کر رہے ہیں اور جو لوگ اس بنا پر مانوس الفاظ نکال کر بھدے اور نئے الفاظ داخل کرنا چاہتے ہیں کہ دیہات والے سمجھ سکیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں جس کی شہری اور دیہاتی بولی میں فرق نہ ہو، یہ ساری خرابی اس وجہ سے ہے کہ ہماری زبان کو سیاسی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ زبان لیجسلیٹو اسمبلی میں نہیں بن سکتی، وہ مجلس قانون ساز ہے، زبان ساز نہیں، یہ ہمارا کام نہیں کہ ہم فیصلہ کریں کہ کون لفظ خارج کرنے کے قابل اور کون داخل کرنے کے لائق ہے۔ یہ کام ڈاکٹر عبدالحق جیسے اہلِ زبان اور علم دوست کا ہے۔ میں اس زبان کے لئے اُردو ہی کا لفظ پسند کرتا ہوں۔ جب کوئی میرے سامنے ہندوستانی کا لفظ کہتا ہے تو میرے دل کو تکلیف ہوتی ہے اور مجھے صدمہ ہوتا ہے۔ حکومت نے کچہریوں کے لئے اُردو کی منظوری تو دے دی ہے، لیکن اس وقت تک اُس کی حیثیت کاغذی حکم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، اُردو زبان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک طرف ہندوستان میں اسلامی تہذیب اورر اسلامی کلچر سے اس کا گہرا تعلق ہے تو دوسری طرف اسی کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے پرانے رشتۂ اتحاد کی یادگار قائم ہے، اُردو کے ساتھ دشمنی کرنی اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر اور ہندو مسلم اتحاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے۔''

(یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ سر تیج بہادر کی صدارتی تقریر کا خلاصہ ہے جو انہوں نے یوم اُردو کے جلسے کے موقعے پر الٰہ آباد میں ۱۸ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو کی تھی۔ کیا آج یہ مژدہ موجودہ حکومت کے لئے لمحۂ فکر یہ نہیں کہ پاکستان ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ وجود میں آیا اور اس کی قومی زبان اُردو ہے لیکن اس وقت تک اُس کی حیثیت بھی کاغذی حکم ہی کی سی ہے۔) بات ہو رہی تھی الٰہ آباد کے یومِ اُردو کے جلسے کی۔

سید صاحب نے کانگریس سے مسلمانوں کی شکایات کا جو دفتر جو بے انتہا وسیع تھا حد درجہ مختصر کر کے بیان کیا پھر بھی ابھی ختم نہیں ہوا۔ کانگریس قربانی تک کی اجازت اپنے صوبوں میں نہیں دے رہی تھی۔ آج انتہائی دکھ کے ساتھ مجھے اس تلخ حقیقت کا اعلان کرنا پڑتا ہے کہ کانگریسی حضرات نے کراچی کے بنیادی حقوق کے طے شدہ اعلان کو طاقِ نسیاں کا گل دستہ بنا دیا۔ آج قربانی کے مسئلہ میں رسم و رواج کی ایسی قید لگائی جا رہی ہے کہ مسلمان اپنے فرائض کو بدل نہیں سکتا، یہ فرائض رواج پر منحصر نہیں اور نہ اکثر جگہوں میں رواج کا ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہاں قربانی عام طور پر گھروں کے اندر کی جاتی ہے، اور اگر چوکیدار کو اس کی اطلاع بھی ہوئی، تو عام طور پر ہندو چوکیدار اور ہندو پولیس افسران کے ہونے کے باعث بہت سے علاقوں کی قربانیوں کا اندراج تھانے کے رجسٹر میں نہیں ہوتا اور پولیس کی مصلحت بھی زیادہ تر یہی ہے کہ کم سے کم جگہوں کے متعلق قربانیوں کا اندراج ہو۔"

رئیس احمد جعفری صاحب کا کہنا ہے:

"سید صاحب بہار کے رہنے والے تھے، وہیں کے حالات سے واقف تھے اس لئے مثالیں بھی زیادہ تر بہار کی پیش کیں، ورنہ درحقیقت سارے ہندوستان میں کیفیت یہی تھی۔" دفعہ ۱۴۴ر کا تیر کانگریسی وزارت کے ترکش سے جس تیزی اور کثرت سے مسلمانوں پر

چلا ہے اُس کی کوئی مثال نہیں۔ اس امنِ عامہ کا بہانہ کر کے متفرق جگہوں پر مسلمانوں کو اپنے شعائر اور حقوق کے ادا کرنے سے جس طرح روکا گیا اس کا تذکرہ بھی ناقابلِ بیان ہے۔

صوبے کے اضلاع میں مسلمانوں پر متعصب برادرانِ وطن کے ہاتھوں مقامی افسران اور خاص کر مسلمان افسران کی کمزوریوں اور حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے جو مظالم ہوئے اور ہو رہے ہیں، وہ حددرجہ المناک ہیں۔ کیا میں کانگریسی وزارت سے اُمید کروں وہ اب بھی تدبیر اور ہوش مندی کا ثبوت دے کر مسلمانوں کے صبر وتحمل کا ناجائز امتحان نہ لے گی۔ کانگریس سے پنڈت نہرو کی قیادت میں پہلے ''مسلم ماس کنٹیکٹ کا دام بچھایا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے شیعہ اور سنیوں کے درمیان افتراق پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔''

غالباً سید صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کانگریس نے پہلے ماس کنٹیکٹ کے ذریعہ مسلمانوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو ذات کی بنا پر اُس کے بکھرے شیرازہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنا چاہتی ہے اور کچھ ناسمجھ مسلمان اس کا شکار بھی ہو رہے ہیں۔ کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کا واحد سیاسی اور قومی ادارہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ یہ تھیں مسلمانوں کی جائز شکایات، جنہیں کانگریس نے رفع نہیں کیا اور بالآخر مجبور ہو کر مسلم لیگ کو اپنی آخری منزلِ مقصود ''پاکستان'' قرار دینا پڑا۔

یہ جملہ قارئین کے لیے طلب ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ قائداعظم کے دور میں کبھی بھی رجعت پسند جماعت نہیں رہی۔ وہ اپنی ترقی پسندی میں کانگریس سے بھی دو قدم آگے رہی، اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں ہوا۔ اس میں مسلم لیگ کا جو منشور اور پروگرام مرتب ہوا وہ یہ تھا:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی حقوق کی حفاظت۔

(۲) تشدد آمیز قوانین کی تنسیخ۔

(۳) اُن تمام قوانین کی مخالفت جو ہندوستان کے مفاد کے لئے مضر ہوں، افراد کے اساسی حقوق پر اثر انداز ہوں یا ملک میں اقتصادی تصرفات کا دروازہ کھولیں۔

(۴) نظم و نسق کے خرچ کو کم کر کے معتد بہ رقوم تعمیری اداروں پر صرف کرنا۔

(۵) ہندوستان کا فوجی خرچ گھٹانا اور فوج کو ہندوستانی بنانا۔

(۶) صنعتوں کو فروغ دینا۔

(۷) کرنسی، مبادلہ اور قیمتوں کو ملک کے اقتصادی فائدے کے مطابق منظم کرنا۔

(۸) دیہاتی آبادی کی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی فلاح کی کوشش کرنا۔

(۹) زراعتی قرضوں میں تخفیف کے قوانین بنانا۔

(۱۰) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازمی کرنا۔

(۱۱) اُردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔

(۱۲) مسلمانوں کی حالت کو عمومی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

(۱۳) محاصل کے بوجھ کو کم کرنا۔

(۱۴) ملک میں صحیح رائے عامہ اور عام سیاسی بیداری پیدا کرنا۔

مسلم لیگ پارٹی مجالس آئین ساز کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے گی اور اس کے پروگرام میں مسلم اقلیت کے مفاد کی حفاظت کے سوا اور کوئی فرقہ وارانہ بات نہ ہوگی۔ متذکرہ صدر پروگرام کے مطابق انتخابی مہم شروع کی گئی جمعیت العلما نے بھی مسلم لیگ کی تائید کی۔

☆......☆......☆

بات ہو رہی تھی ۱۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء کے حوالے سے۔ ہوا، یوں کہ کانگریس کے موجودہ لیڈروں نے خاص کر گزشتہ دس سال کے اندر ایسی ہندوانہ پالیسی اختیار کی ہے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف پیدا کرنے کے لئے ذمے دار ہے اور جب سے ہندوستان کے چھ صوبوں کے اندر انہوں نے اپنی اکثریت کی بنا پر حکومتیں قائم کی ہیں، انہوں نے اپنے قول و پروگرام سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہرگز عدل و انصاف سے کام نہیں لیں گے۔ جہاں کہیں وہ اکثریت میں ہیں اور جہاں کہیں انہیں یہ مفید معلوم ہوا، انہوں نے مسلم لیگ

کی پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور اُن سے غیر مشروط حوالگی اور اُن کے مرتبہ معاہدات پر دستخط کرنے کا مطالبہ کیا۔

کانگریس کا مطالبہ یہ تھا کہ اپنی پارٹی کو توڑ دو۔ اپنی پالیسی اور پروگرام ترک کر دو اور مسلم لیگ کا بالکل خاتمہ کر دو۔ (یہ وہ سیاسی چال ہے جو ہمیشہ سے سیاست میں رواں رہی ہے۔ جب بھی کوئی سیاسی پارٹی مستحکم محسوس کی جاتی ہے تو خائف سیاسی مدِ مقابل کی خواہش ہوتی ہے اُسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ اسے نیست و نابود کر دیا جائے لیکن ہوتا ہمیشہ اس کے برعکس ہے۔ چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں کے سامنے مولانا آزاد نے یہی شرط رکھی تھی جسے ان دونوں بزرگوں نے مسترد کر دیا تھا) اور جہاں انہوں نے صوبہ سرحد کی طرح یہ محسوس کیا کہ اُن کی اکثریت موجود نہیں تو وہاں اجتماعی ذمے داری کا مقدس اصول غائب ہو گیا اور اس بات کا علم تھا کہ اسمبلیوں کے اندر یا باہر مسلمان نمائندوں کی حیثیت سے انہیں کوعزت حاصل نہیں۔

اگر اقلیتوں کی حفاظت کے لئے حکومت برطانیہ کی اختیار کردہ مقدس ذمے داری انجام دہی میں گورنر بالکل بے بس اور نا اہل ثابت ہوئے ہیں تو کیا ایسے سینکڑوں معاملات میں جو عوام کے علم میں نہیں آئیں گے یا اسمبلیوں اور روزمرہ کے نظم و نسق میں اُن کے متعلق کسی کو علم بھی نہیں ہوگا، وہ حفاظت کے فرائض انجام دے سکیں گے! اس معاملے میں حالاتِ زمانہ ہمیں کسی اور طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان خوش گوار سبق کو بہت جلد سیکھ لیں کہ ان حالات میں راستہ بالکل صاف ہے، انہیں یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ انہیں اپنے آپ کو باقی ہر قسم کے خیالات سے خالی الذہن ہو کر یکسوئی کے ساتھ منظم کرنے اور اپنی تمام قوتوں کو ایک مرکز پر لانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں اس سے قبل یہ اشارہ کر چکا ہوں کہ مسلمان باہم منقسم ہیں اور اُن میں ایک ایسی جماعت موجود ہے جو اپنی نجات کے لئے حکومتِ برطانیہ کے سہارے کی منتظر ہے۔ اگر اب بھی تلخ تجربات سے انہیں سبق حاصل نہیں ہوا تو وہ اس کے بعد کبھی بھی بیدار نہیں ہو سکیں گے۔ خدا انہی کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ ایک دوسری جماعت وہ ہے جو کانگریس سے امداد و حمایت کی طلب گار ہے، اُن کے اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ اُسے اپنی ذات پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اوپر اعتماد کرنا اور اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھ میں لینا سیکھیں، ہمیں ایسے راسخ

العقیدہ اہلِ ہمت اور اصحابِ عزم کی ضرورت ہے جو اپنے معتقدات کی حفاظت کے لیے تمام دنیا کے مقابلے میں تنِ تنہا ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں۔ ہمیں طاقت اور عزم پیدا کرنا چاہیے اور یہ طاقت اور عزم مسلمانوں کے باہمی انضباط اور وحدت کے بغیر حاصل نہ ہو سکے گا۔ چونکہ کسی صاحبِ اختیار ہندو لیڈر کی طرف سے مفاہمت کے لیے کسی مخلصانہ خواہش اور دلچسپی کا اظہار نہیں ہو رہا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ کسی سمجھوتے کا کوئی امکان نہیں، معززانہ مفاہمت صرف مساوی الحیثیت جماعتوں کے درمیان ہی ممکن ہو سکتی ہے اور جب تک فریقین میں باہمی عزت و احترام کا جذبہ پیدا نہ ہو کسی مفاہمت کے لیے کوئی ٹھوس زمین تیار نہیں ہو سکتی۔ کمزور فریق کی طرف سے دعوتِ مصالحت کا مطلب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ اُس کو اپنی کمزوری اور ضعف کا اقرار ہے اور وہ فریقِ ثانی کے غیض وغضب کا تختۂ مشق بننے کے لئے تیار ہے۔ حب وطن، عدل و انصاف اور مروت کی تمام اپیلیں بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے کسی خاص سیاسی شعور کی ضرورت نہیں جب تک تحفظات و مفاہمت کی پشت پر طاقت موجود نہیں ہوگی وہ محض کاغذ کے پرزے ثابت ہوں گے۔ سیاسیات کا مطلب طاقت ہے اور یہ نہیں کہ عدل وانصاف اور مروت کی فریادوں پر بھروسہ کیا جائے۔ آپ اقوامِ عالم اور ان کے روزمرہ کے واقعات سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ چین، اسپین اور فلسطین کے اندوہ ناک واقعات پر غور کریں کانگریس ہائی کمان مختلف آوازوں کے ساتھ بول رہی ہے، ایک حلقے کی رائے یہ ہے کہ یہاں پر ہندو مسلم اور اقلیتوں کا کوئی جھگڑا نہیں۔ دوسرے بلند خیال طبقے کی رائے یہ ہے کہ اگر اس وقت غیر منظم اور بے بس مسلمانوں کے روبرو چند ٹکڑے پھینک دیئے جائیں تو ان کو اپنا مطیع اور فرماں بردار بنایا جاسکتا ہے تو وہ یقیناً ایک افسوسناک غلطی میں مبتلا ہیں۔

اب آل انڈیا مسلم لیگ نے زندہ رہنے اور سیاسیاتِ ہند میں اپنا سکہ جمانے کا عزم کرلیا ہے۔ اس لئے اس حقیقت کا جس قدر جلد احساس کرلیا جائے وہ تمام جماعتوں اور مفادوں کے لئے اُسی قدر مفید رہے گا۔ تیسرے حلقے کی رائے یہ ہے کہ نا قابلِ گریز تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن جوں جوں کانگریس کو طاقت اور قوت حاصل ہوتی جاتی ہے وہ سابقہ کیے گئے وعدوں کو فراموش کرتی جارہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان حالات پر غور کرنے کے بعد

مسلمانانِ ہند ایک ایسی معین اور ہمہ گیر پالیسی کے ذریعے اپنی تقدیر کا فیصلہ کرلیں جس پر تمام ہندوستان میں نہایت وفاداری کے ساتھ عمل کیا جائے۔ کانگریسی مسلمانوں کی طرف سے غیر مشروط حوالگی کی تبلیغ بے حد خطرناک ہے۔ یہ شکست خوردہ ذہنیت کی انتہا ہے کہ اپنے آپ کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں اور مسلمان قوم کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی بڑی غداری نہیں ہوسکتی اور اگر اس پالیسی کو اختیار کرلیا گیا تو میں آپ کو بتادوں کہ مسلمان اپنے مستقبل کا اپنے ہاتھوں سے خاتمہ کرلیں گے اور ملک کی قومی زندگی اور حکومت میں وہ اپنے جائز حقوق سے محروم ہو جائیں گے۔ صرف ایک چیز مسلمانوں کی حفاظت اور اُن کے کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کا ذریعہ بن سکتی ہے، انہیں چاہئے کہ وہ سب سے پہلے اپنی روحوں کو مسخر کرکے اپنی ان عظیم الشان روایات اور اصولِ وحدت پر قائم ہوجائیں جو اُن کی سیاسی جماعت بندی کا طغرائے امتیاز ہیں۔ اگر مسلمانوں کو فرقہ پرست ٹولہ اور رجعت پسند کہا جاتا ہے تو آپ اس کی پروانہ کریں اگر کوئی بدترین ٹوڈی اور مذموم ترین فرقہ پرست آج اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر کانگریس کے حوالے کرکے اپنے بھائیوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنائے تو وہ قوم پرستوں کا تاجدار بن جاتا ہے۔ ان اصلاحات، الفاظ اور گالیوں کا مطلب ومقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر احساسِ کمتری پیدا کرکے اُن کو کمزور اور بزدل بنایا جائے اور ہمارے اندر اختلافات پیدا کرکے ہمیں دنیا میں بدنام کیا جائے، یہ بُرے کا معیار ہے جس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی طے شدہ پالیسی یہ ہے کہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق وواجبات کی موثر حفاظت کی جائے، اس کا بنیادی اور سب سے بڑا اصول ہے۔ یہی اس کی زندگی کا نصب العین ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مسلم لیگ اور اُس کے حامیوں سے کانگریس سخت ناراض ہورہی ہے اور اس کے علاوہ ہے کیا جس پر کانگریس کو اعتراض ہے؟ کانگریس بعینہٖ وہی کچھ کررہی ہے جس کے متعلق ہم نے آج سے دو سال قبل فیصلہ کیا تھا، لیگ اس بات کی ہرگز اجازت نہ دے گی کہ حکومتِ برطانیہ یا اسمبلیوں کے اندر اور باہر کوئی دوسری جماعت اُن کے مفادات کو کوئی نقصان پہنچا سکے۔ کانگریس سے اپنے گزشتہ دعوؤں کے باوجود مسلمانوں کے لئے اب تک کچھ نہیں کیا، یہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کو حفاظت کا یقین دلانے میں سخت ناکام رہی ہے۔ کانگریس کی طرف سے مسلمانوں میں رابطہ عوام

پیدا کرنے کی فریب آلود کوشش کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اُن میں اختلافات پیدا کر کے اُن کو کمزور کر دیا جائے اور اُن کو اپنے قابلِ اعتماد لیڈروں سے برگشتہ کر دیا جائے، یہ نہایت خطرناک تحریک ہے لیکن کوئی شخص اس سے گمراہ نہیں ہوسکتا۔ مختلف النوع و دلفریب دعووں اور نعروں کے باوجود اس قسم کی چالیں کامیاب نہ ہوسکیں گی۔

اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے بغیر کوئی دیانت دارانہ اور سیدھا راستہ نہیں ہوسکتا، بھوک اور افلاس کے متعلق اس تمام شور کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں سوشلزم اور کمیونزم کا بیج بویا جائے حالانکہ وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ بحالاتِ موجودہ حکومت کے خلاف براہِ راست کاروائی کی پالیسی مسلم لیگ کے نزدیک بالکل فضول اور خودکشی کے برابر ہے۔ اس قسم کی دو کوششیں اب تک ناکام ہوچکی ہیں اور اُن کے باعث لوگوں کو کافی مصیبت اور پریشانی کا مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ چنانچہ بیس سال کے تجربہ کے بعد ان کو ترک کرنا پڑا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم پر ایک زیادہ پسندانہ دستور مسلط کیا گیا اور لطف یہ ہے کہ اب اس پر عمل ہوا ہے۔

اس قرارداد کے ذریعہ سے گورنر جنرل سے یہ درخواست کرنا کہ وہ وزیرِ ہند کو ہمارے اس مطالبے سے مطلع کردیں کہ حقِ رائے دہی بالغان کی بنا پر ایک مجلسِ دستور ساز کی معرفت ہندوستان کے آئندہ آئین کا خاکہ تیار کرالیا جائے۔ یہ بے خبری کی انتہا ہے اس سے یہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اس قسم کا مطالبہ پیش کرنے والے واقعات اور حقائق سے کس قدر نا آشنا ہیں۔ دستوری اسمبلی کے قیام کا حق صرف کسی والیِ ملک یا تاجدار کو حاصل ہے۔ شاہی اختیار کی معرفت ایسے نمائندگانِ ملک کی ایک مخصوص جماعت منتخب کرلی جائے جو اپنی مرضی کے مطابق ملک کو دستور مرتب کردیں۔ اس کے بعد اُن کا کام ختم ہوجاتا ہے اور اُن کا مرتبہ دستورِ ملک کے آئینِ حکومت کی حیثیت سے نافذ ہوجاتا ہے۔

☆......☆......☆

ان چار دنوں میں پاکستان کے دیگر شہروں کے علاوہ صرف کراچی میں آخری خبریں آنے تک 100 / افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ جن میں 5 / سال کی بچی سے لے کر ضعیف العمر لوگ بھی شامل ہیں۔ کمال یہ ہے کہ ان میں اکثریت نہ تو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہے اور نہ ہی

کسی مذہبی جماعت سے۔ یہ بے قصور معصوم شہری کس جرم کی پاداش میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کررہے ہیں، ان سے کوئی اپنے گھر کا واحد کفیل ہے، کوئی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے، کوئی اپنی ماں کا خدا کے بعد آخری سہارا ہے۔ اسی ملک کی دھرتی ان کی خون کی پیاسی ہے۔ یہ بات کہی تو جا رہی ہے لیکن وثوق سے نہیں کہی جاسکتی وہ جو یہ سفاکانہ عمل کررہے ہیں ان کا تعلق بھی اسی ملک سے ہے۔ اگر نہیں تو پھر وہ لوگ کون ہیں۔

ایک طبقۂ خاص کا خیال ہے کہ یہ ڈرگ مافیا ہے، کوئی کہتا ہے یہ لینڈ مافیا ہے، کچھ کا خیال ہے یہ دہشت گرد ہیں، ان کا تعلق طالبان سے ہے، کیا کسی ملک کے یہ چھوٹے چھوٹے گروپ اس قدر طاقت ور ہوسکتے ہیں کہ حکومت کی رٹ کو چیلنج کرسکیں۔ ہرگز نہیں۔

سربراہانِ مملکت صدر یا وزیرِاعظم ایک کمیشن قائم کریں جو ہر بات کی تحقیق کرے کہ چار دن سے امن وامان کے رکھوالے تماشائیوں کا کردار کیوں ادا کررہے تھے، حکومت میں اتحادی کے طور پر شامل ہو جانا یا حزبِ اختلاف کی بینچوں پر بیٹھ جانا سیاسی عمل میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

قوم کی خدمت کرنے والے نواب لیاقت علی خان کو شہید کیا گیا تو اُن کی قمیض میں پیوند لگا تھا اور بہت قلیل سی رقم اُن کے بینک میں تھی۔ ملک کی خدمت کرنے اور ملک پر حکومت کرنے میں بڑا فرق ہے۔ حکمائے وقت لائحۂ عمل تیار کرکے دے دیتے ہیں، انہیں حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

میرے ملک کا سانحہ یہ ہے کہ محبِ وطن لیڈر بہت جلد ساتھ چھوڑ گئے، اس ملک کا ہر فرد محبِ وطن لیڈر بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ قائداعظم کے فرمودات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے اور اُس پر عمل کرے تو ہر مسئلے کا حل بخوبی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہمارے کرم فرما سید شاکر علی صاحب خوب پتے کی بات کہتے ہیں کہ بھائی جو قوم خدا کے احکامات کو نہیں مانتی، رسول کے فرمودات کو خاطر میں نہیں لاتی، والدین کی نہیں سنتی تو قائداعظم کے فرمودات پر کیسے عمل کرے گی۔ یہ بات سن کر ذہن پریشان تو ہوتا ہے لیکن وہ کون سا احساس ہے جو اس جذبے کو توانا رکھتا ہے کہ سازشی عناصر کچھ بھی کرلیں لیکن پاکستان کا بال بانکا نہیں ہوسکتا ابھی یہ کالم اختتام کے مراحل میں داخل نہیں ہوا کہ خبر آئی کہ حساس علاقوں کو رینجرز و پولیس کے سپرد کردیا گیا ہے۔ رینجرز نے حسبِ معمول اپنی ذمے داریاں نبھاتے ہوئے محصور لوگوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو محفوظ مقام تک پہنچایا اور

بھوکے پیاسے لوگوں کے لئے انتظام سنبھالا۔ دس بارہ گھنٹوں کی کوششوں سے حالات میں بہت بہتری آگئی۔ یہ سوال ہر ذی شعور کے ذہن میں گردش کر رہا ہے کہ جب دس بارہ گھنٹوں میں حالات کو اعتدال پر لایا جاسکتا تھا تو پھر یہ عمل چار دن تاخیر سے 101 / انسانوں کے خون کی ہولی کے بعد کیوں کارگر ہوا۔ کسی بھی ملک کی ترقی و تنزلی کا انحصار اُس ملک کی عدلیہ پر ہوتا ہے۔ جب انگلستان زمانے کے لئے عبرت کا نشان بننے لگا اور ہر شعبہ کمزور سے کمزور ہوتا گیا تو اُس سربراہ، نام اس وقت ذہن میں نہیں، اُس نے دریافت کیا کہ ملک کی صنعت کا کیا حال ہے؟ جواب ملا: بہت ناگفتہ بہ ہے، بینکنگ کا حال، جواب تھا بہت ناقص، غرض ہر شعبے کے معلومات کے جواب میں مایوس کن جوابات ملے لیکن جب اُس نے پوچھا کہ ملک کی عدلیہ کا کیا حال ہے تو جواب ملا کہ عدلیہ پوری ذمے داری سے اپنا فرض نبھا رہی ہے۔ تو اُس سربراہ نے جواب دیا کہ فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ سب پریشانیاں عارضی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور بہت بہتر ہو جائے گا اور ایسا ہی ہوا، بلکہ ایسا کہ وہ وقت آپہنچا کہ فرنگی حکومت کی ریاست میں سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ عرضِ مدّعا یہ ہے کہ چاہے ملک کتنی بھی بدحالی کا شکار ہو، اگر عدلیہ اپنا فرضِ منصبی ایمان داری سے نبھا رہی ہے تو سب کچھ ٹھیک ہو کر رہے گا یوں تو عدلیہ گزشتہ کافی عرصے سے بہت اہم مسئلوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، نہ صرف کڑی نظر رکھے ہوئے ہے بلکہ بہت سے معاملات تو اپنی تحویل میں لے کر حلق میں ہاتھ ڈال کر غصب شدہ رقوم کو نکلوایا گیا ہے اور نکلوایا جا رہا ہے۔ امید قوی ہے کہ ملک کے عوام کی خونِ پسینے سے کمائی ہوئی رقم کی ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے گا۔ اس ملک کو خدا نے ہر نعمت سے نوازا ہے۔ سمندر، پہاڑ، دریا، جنگل، میدان، زراعت، پھل، اجناس، معدنیات۔ اس ملک کو 64 / سال سے گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں لیکن یہ ابھی بھی زندہ ہے۔ بقول شاکر صاحب کے اگر یہ صورتِ حال امریکا کے ساتھ 10% بھی ہوتی تو وہ کب کا تباہ ہو چکا ہوتا۔ عدلیہ کے ذمے داران کی پوری پاکستان پر نظر ہے اور وہ بخوبی اپنے فرائضِ منصبی انجام دے رہے ہیں۔ عوام کی عدالت یہ جاننے کے لئے بے تاب ہے کہ چار دن میں 101 / انسانی جانوں کا زیاں، اور پانچویں دن سے بتدریج سکون۔ اُن عوامل کو تلاش کیا جائے جن کی بدولت اس قدر جانی نقصان ہوا۔ اگر اس قسم کے حساس معاملات کے حقائق معلوم

کرنے میں عدلیہ بھی اپنا حصہ بٹائے گی تو کراچی سے لنڈی کوتل تک امن ہی امن ہوگا اور پاکستان کے دشمن عناصر کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکیں گے۔ ہماری اصلاح قومی یکجہتی میں مضمر ہے، قومی یکجہتی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ یہ قائداعظم کے دوررس مشورے تھے جن پر عمل پیرا ہو کر ہم آج ایک آزاد مملکت پاکستان میں سانس لے رہے ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اُس وقت جب علم دشمن اور اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے خون سے انتقام کی آگ بجھا رہے تھے اور قائداعظم سمجھا رہے تھے:

"مجھے معلوم ہے کہ مسلمانوں کو ہر جگہ بڑا نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے لیکن سانحہ بہار کے سامنے دیگر تمام واقعات اور مظالم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میں بربریت اور ظلم کو سخت نفرت سے دیکھتا ہوں خواہ وہ کسی شکل وصورت میں ہوں، لیکن بہار میں جو قیامت بپا کی گئی ہے اُس کی نہ تو کوئی مثال ہے اور نہ اس کا ثانی، ہندوستان میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ سفاکانہ قتلِ عام ہے جو ہندو اکثریت نے مسلمان اقلیت کو نہایت بے دردی کے ساتھ کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمانوں کے دلوں کا اس وقت کیا حال ہے مگر میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ان مظلوم مسلمانانِ بہار کا بدلہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں لینا ایک بڑی بھاری سیاسی اور اخلاقی غلطی ہوگی اور اگر ایسا ہوا تو ہم اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیلیں گے (ایسے اشتعال انگیز اور ہیجان آفریں موقع پر بھی ہوش و حواس کا قائم رکھنا اور اعتدال وتوازن کے راستے پر گامزن رہنا قائداعظم ہی کا کام تھا) اگر آپ حقیقت میں پاکستان چاہتے ہیں تو میں خداوندِ کریم سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگے جس کا مظاہرہ مظلوم مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کرکے بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب وشرافت کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہورہے ہیں اُن سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہورہا ہے مگر ہم مسلم اکثریت

والے بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہ کریں گے، ہم کو سیاسی طور سے بتا دینا چاہیے کہ ہم بہادر اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے والے ایمان دار اور سچے مسلمان ہیں، پاکستان میں غیر مسلم اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت خود مسلمانوں سے بڑھ کر پائیں گے، اگر مسلمانوں نے دامنِ صبر و رضا کو ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اپنا توازن کھو دیا اور اسلام نے جو عدیم المثال سبق دنیا کو سکھایا ہے اُسے بھلا دیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نہ صرف اپنے حق پاکستان کو کھو دیں گے بلکہ ہندوستان میں وہ کشت و خون ہوگا جس سے ہماری آزادی کے دن دور ہٹ جائیں گے اور ہم اپنی غلامی کی بیڑیاں اپنے ہی ہاتھوں سے مضبوط کریں گے۔ مجھے خوشی ہے کہ مسلم اکثریت والے صوبوں میں امن و امان ہے اور اس ظلم و فساد اور کشت و خون میں شامل نہیں ہیں۔ جس کا مظاہرہ باقی سارے ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ میں ایک بار پھر اُن تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جہاں بھی اکثریت میں ہوں غیر مسلموں کی حفاظتِ جان و مال کے لئے جو کچھ ممکن ہو کریں اور اُن میں بھروسہ پیدا کریں۔ اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں جو بے گناہ مسلمانان شہید کئے گئے ہیں یا زخمی ہوئے ہیں یا مال و اسباب لوٹا گیا ہے، اُن کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ یہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگِ پاکستان اور آزادی کے لئے اپنا حق ادا کر دیا۔''

قائداعظم کے فرمان کی روشنی میں یہ بات عیاں ہوگئی کہ مثبت مقاصد حاصل کرنے کے لئے جنگ و جدل کی ضرورت نہیں، صبر، برداشت اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے جو عملی طور پر پاکستان کی شکل میں ہمارے سامنے ہے، اور آج کی عفو و درگزر کے نتائج کل کے مضبوط و مستحکم پاکستان کی شکل میں ہمارے سامنے ہوں گے۔

☆......☆......☆

ملک آج کل جن ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہے، اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے وہ کوئی ایک دن کی بات نہیں۔ یہ ایک منظم سازش کا نتیجہ ہے جس کی داغ بیل اُن ملک دشمن عناصر نے اُس وقت رکھ دی تھی جب وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو گئے تھے کہ ہندوستان سے صرف انگریزوں سے نجات حاصل کر کے آزادی حاصل کی جائے اور ہندو مسلم مشترکہ طور پر رہیں اس میں فتنہ پروری کا عنصر اس طرح شامل تھا ہندوستان میں مسلم حکمرانی کے وقت بھی ہندوؤں کی اکثریت تھی لیکن حکومت مسلمان کرتے رہے۔ اب سارے مسلم دشمن عناصر اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ انگریزوں سے نجات کے بعد مسلمانوں کو اقلیت قرار دے کر اُن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے رہیں۔

لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت کے باوجود ان کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لئے مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے اللہ تعالیٰ نے قائداعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں کے لئے وہ مسیحا بنا کر بھیجا جس نے جذبۂ اسلامی، جذبۂ ایمانی کا علم بلند کر کے فرنگی اور ہندی منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

قوم کو متحد کر کے علیحدہ مملکت حاصل کرنا کوئی نئی بات تو نہیں، اس میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایک ہی شخص جسے ہم قائداعظم محمد علی جناح کے نام سے جانتے ہیں اُن کا یہ کارنامہ تاریخ میں وہ روشن باب ہے کہ اپنی ہی حیات میں جدوجہد کرنا، معدودے چند ہونے کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب ہونا۔ یہ وہ انعام ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ نسلِ نو پریشان ہے کہ کل کیا ہو گا، کچھ نہیں ہوگا، کوئی ابتری نہیں آئے گی، کوئی مشکل حائل نہیں ہوگی، کوئی مسائل پیدا نہیں ہوں گے، بلکہ حل ہوتے چلے جائیں گے۔ صرف اور صرف قائداعظم کے اندازِ فکر اور اُن کے فرمودات پر عمل کر کے۔

قائداعظم نے ۱۱راگست ۱۹۴۷ء کو جب پہلی بار دستور ساز اسمبلی سے خطاب فرمایا تو ان کی دانش ورانہ ذہنیت اور دور رس نگاہیں آنے والے تمام مسائل پر تھیں، بظاہر سوٹ میں ملبوس، برطانیہ کا تعلیم یافتہ، قانون دان، صرف اور صرف برطانوی تعلیم پر اکتفا نہیں کر رہا تھا بلکہ اُس سے کہیں زیادہ اسلامی تعلیمات کا بھی بچشمِ غائر مطالعہ کرتا رہا تھا اور پھر وہ وہاں کے یعنی یورپی ماحول

کے تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ سب قلاش ہیں انہوں نے سب کچھ مسلمانوں سے مستعار لیا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ وہ قوموں کو جو اس وقت حاکم نظر آتی تھیں انہیں بھی بہت برے وقت دیکھنا پڑے ہیں لیکن انہوں نے اسلام کے اصولوں کو اپنانے کی صلاحیتیں پیدا کیں اور کامیاب ہوئے۔ بس یہ تھا قائد اعظم کا نکتۂ نظر، جو لوگ ہمارے اصولوں پر چل کر ہمیں خاکستر کر رہے ہیں تو ہم دوبارہ اپنے اصولوں پر گامزن ہو کر اُن سے نجات حاصل کیوں نہیں کر سکتے اور اس کا عملی ثبوت قائد اعظم نے مملکتِ خداداد کی صورت میں پاکستان کے نام سے ہمیں دیا۔ ہماری بدقسمتی کہ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی اور بہت جلد وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے مگر اس مختصر عرصے میں بھی قائد اعظم نے آنے والے وقتوں کے لئے لائحۂ عمل تفویض کئے، اس لائحۂ عمل کا مرکزی نکتۂ نظر میثاقِ مدینہ سے اخذ کیا گیا تھا، قائد اعظم نے صرف پاکستان بنایا ہی نہیں بلکہ اُس کے مستقبل کی راہوں کا بھی تعین کیا، آپ نے دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہوتے ہی سب سے پہلے شکریہ ادا کرنے کے بعد جو بات سب سے پہلے آپ تک پہنچائی وہ اُس اسمبلی کی اہم ذمے داریوں کی یاددہانی تھی (جنہیں ہم آج فراموش کر چکے ہیں) کہ اُن کے ذمے دستور سازی اور قانون سازی کا کتنا اہم فریضہ ہے۔ اب آپ ایک آزاد خود مختار مملکت ہیں اور اسی وجہ سے آپ کی ذمے داری دو چند ہو جاتی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ کسی بھی حکومت کی سب سے پہلی ذمے داری وہاں امنِ عامہ قائم کرنا ہے تا کہ وہاں کے شہریوں کی جان و مال اور ان کی مذہبی اعتقادات کی پوری پوری حفاظت ہو سکے۔ اس کے بعد انہوں نے رشوت اور بددیانتی کی لعنت سے دور رہنے کی تلقین فرمائی کہ ایک اچھی اسلامی حکومت کی یہ بنیادی پہچان ہے، اسی طرح چور بازاری سے چھٹکارے کی تلقین کی کیونکہ اُس وقت دوسری جنگِ عظیم اور تقسیمِ ہند کی وجہ سے یہ کج روی بہت عام ہو چکی تھی۔

سردار محمد چوہدری صاحب ہمارے ذہنوں کو روشن کرنے کے لئے ہمارے ارادوں کو مستحکم کرنے کے لئے، ہمیں ایک غیور قوم کی طرح زندہ رکھنے کے لئے قائد اعظم کی ایک ایک بات ہر ایک پند و نصیحت، ان کی قانونی، اسلامی، دانشوری کے واقعات اس طرح ہمارے سامنے رکھ رہے ہیں کہ ہمیں کسی طرف دیکھنے کی، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں، ہمیں تو قدرت نے ایسا خطۂ نایاب پاکستان کی شکل میں عطا کیا ہے جو ہر اعتبار سے ایک عطیہ ہے، نعمتوں سے لبریز

ہے، سمندر، پہاڑ، جنگل، زرخیز زمینیں، معدنی وسائل اور سب سے اہم جغرافیائی اہمیت۔ راقم قطعاً پریشان نہیں کہ ہمارے ملک کا کیا حشر ہوگا، پریشانیاں جب حد سے تجاوز کر جائیں تو حل میں تبدیلی ہو جاتی ہیں۔ میثاقِ مدینہ سے اخذ کردہ منشور جو قائداعظم نے ہمیں دیا وہ ہمارے لئے ایسی مشعلِ راہ ہے کہ جس کی موجودگی میں چنداں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ یہ میری قوم کا مستقبل بچے جنہیں آج ہم چور، ڈاکو، قاتل، بھتہ خور، اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں ملوث پا رہے ہیں۔ ہمیں اس کی وجہِ تسمیہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، وہ سب کچھ ہمیں بتایا گیا ہے، وہ کامیاب اور بہتری کے رموز ہمارے پاس موجود ہیں۔ ذمے دار وہ ہیں جو اُن پر عمل پیرا نہ ہو کر اس ماحول کو جنم دے رہے ہیں کہ معاشرہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔

قائداعظم نے نئی مملکت کے دو بہت ہی اہم مسائل اور جہتوں کا بہت ہی خوب صورت، بنیادی اور حقیقت پسندانہ تجزیہ پیش کر کے اُس کا حل پیش کیا۔ تقسیم لازم تھی اور پھر ہجرت بھی انتہائی تکلیف دہ تھی۔ مگر یہ وہ قیمت ہے جو اہلِ ایمان کو دینا ہی پڑتی ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے بھی یہ قیمت دینا پڑی تھی۔ اس لئے تو اُن کے درجے بلند ہو گئے تھے۔ مگر مومن و متقی کا فرض ہے کہ سرِ تسلیم فوری طور پر خم بھی کرے، اس میں شک کی گنجائش نہیں ہوتی، تبھی جا کر اصل فوز و فلاح ملتی ہے۔ پاکستان اور اس کا شہری اپنی تخلیق کے وقت وہیں کھڑا تھا جہاں کہ مصیبت اٹھانے والے مہاجر چودہ سو سال پہلے کھڑے تھے اور اس کا سہرا حضرت قائداعظم کے سر تھا، کھڑا آج بھی وہیں ہے مگر ذرا مختلف انداز میں، ایک خطہ اور ایک قوم کے ساتھ۔ یہ مرحلہ طے کرنا اُس مرحلے سے بہت زیادہ آسان ہے۔ اُس صورتِ حال کا احاطہ کرتے ہوئے قائداعظم فرماتے ہیں:

> ''مجھے معلوم ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تقسیمِ ہند اور تقسیمِ پنجاب و بنگال سے پوری طرح متفق نہیں ہیں، اس کے خلاف بہت کچھ کہا جا چکا ہے مگر اب یہ بات قبول کی جا چکی ہے، یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اب ہم اس معاہدے کا نہایت ایمان داری اور وفاداری سے احترام کریں اور اس پر عمل کریں۔ یہ سب کے لئے ضروری ہے اور مکمل پابندی کا تقاضا کرتا ہے مگر یاد رکھئے جیسے میں یہ بات بہت دفعہ کہہ چکا

ہوں کہ یہ عظیم انقلاب جو اَب آچکا ہے وہ اپنی نوعیت میں بے مثل اور منفرد ہے۔

اس وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی دوسری صورت ممکن بھی تھی، عملی طور پر کوئی اور دوسرا راستہ موجود بھی تھا جس پر چلا جاسکتا تھا۔ نہیں تقسیم ناگزیر تھی، بھارت اور پاکستان کے دونوں اطراف بہت سے لوگ ہیں جو تقسیم سے متفق نہیں ہیں، بہت سے لوگ ہیں جو اسے پسند نہیں کرتے لیکن میرے خیال میں اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی موجود نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ اس کے حق میں فیصلہ دے گی اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ جوں جوں وقت گزرے گا حقیقی تجربہ ثابت کر دے گا کہ یہی ایک واحد حل تھا۔ متحدہ ہندوستان کا آئیڈیا عملی طور پر پنپ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے خیال میں اس صورت میں مکمل تباہی ہمارا مقدر کہلاتی۔ یہ سب کچھ وقت ثابت کر دے گا۔''

☆......☆......☆

اگر اُس وقت متحدہ ہندوستان تسلیم کرلیا جاتا تو ہندوستان تو ہوتا لیکن مسلمانوں کا وجود صفحۂ تاریخ میں مظلوم اقلیت کے طور پر آتا۔ جیسا کہ آج کل بھارت میں باقی ماندہ مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بقول سردار محمد چوہدری اور وقت نے اس بالغ نظر انسان کا ایک ایک لفظ سچ کر دکھایا۔ محمد علی جناح واقعی بہت بڑا انسان تھا اور وہ مستقبل کا دل چیر کر دیکھ سکتا تھا، اسے کہتے ہیں مدبر، وہ سب کچھ صاف صاف دیکھ رہا تھا اور یہی عظیم قیادت کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ وہ نعرہ بازی اور جذباتیت سے بہت بلند اٹھ کر دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور قائد اعظم محمد علی جناح کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔

ملک کی موجودہ صورتِ حال تشویش ناک ضرور محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں کہ ہم مایوس ہو جائیں۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اساس جمہوریت پر قائم ہے۔ جب ہم نے اسے حاصل کیا اُس وقت بھی ہمارے پاس کوئی فوج فاٹا نہیں تھی۔ تیر وتفنگ بھی نہ تھے۔ ہمارا

سرمایہ جمہوری انداز، بےلوث قیادت قائداعظم محمد علی جناح کی صورت میں ہماری رہبر تھی۔ وہ قیادت کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھی۔ اسی شہرِ کراچی کے ایک تاجر گھرانے میں جنم لینے والے بچے نے وقت آنے پر یقینِ محکم، عملِ پیہم کا عملی مظاہرہ کیا تو بکھری ہوئی قوم کو یکجا کر کے ایک ناقابلِ تسخیر چٹان کی مانند شاطروں کے سامنے کھڑا کر دیا، اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ جذبہٗ کامل ہو، قیادت باصلاحیت تو ہم کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتے جس کی زندہ مثال کہ ایک ایک وقت میں چار چار ہزار جانوں کی قربانیاں دینا پڑیں اور دیں نتیجہ کے طور پر فرنگی جیسی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ بات ہے مخلص قیادت کی، بےغرض، ایمان دار، ذہین قیادت نے جسے قائد اعظم محمد علی جناح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چودہ سو سال قبل کے بتائے ہوئے اصولوں پر گامزن ہو کر غلامی کا چولا اُتار پھینکا، آج کی بےحالی کا علاج بھی اسی میں مضمر ہے کہ ہم اپنے قائد اعظم کے بتائے ہوئے اصولوں پر گامزن ہو کر پریشانیوں سے نجات اور کامیابیوں کا تاج پہن سکتے ہیں۔

قائداعظم نے فرمایا:

> ”تقسیم ناگزیر تھی، اس کے سوا اور کوئی حل موجود ہی نہیں تھا، تو اب ہم کیا کریں۔ اب اگر آپ اس مملکت کو خوش و خُوش حال دیکھنا چاہتے ہیں تو آیئے ہم سب مل کر عوام خاص طور پر غریب لوگوں کی بہتری اور فلاح کے لئے اپنی توانائیاں مرکوز و مجتمع کر دیں۔ اگر آپ ماضی کی تلخیوں اور دشمنیوں کو بھول کر مل جل کر کام کریں تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ اگر آپ اپنے ماضی کو تبدیل کر سکیں اور بھول سکیں کہ آپ کے پہلے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کیسے تھے، آپ بھول جائیں کہ آپ کی ذات پات کیا تھی، اس کا رنگ اور فرقہ کیا تھا اور یاد رکھیں کہ آپ اول، دوم اور آخر کار مملکتِ پاکستان کے شہری ہیں۔ جن کے حقوق و فرائض سب برابر ہیں اگر آپ نے یہ کر لیا تو پھر آپ کی ترقی و رفعت کی کوئی حد نہیں رہ جائے گی۔ آپ سب اس ملک کے برابر کے اور آزاد شہری ہیں۔“

سردار محمد چوہدری ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ذرا فتحِ مکہ کا منظر سامنے لائیں جہاں آپ حضورؐ نے سب خون معاف کر دیئے اور سب سے پہلے اپنے عزیزوں کے خون معاف فرمائے تھے۔ معافی میں ہی کامرانی ہوتی ہے۔ بدلہ بد کا کام ہوتا ہے۔ بڑے لوگ بدلے کی بات نہیں کرتے، وہ ماضی میں پھنس کر بھی نہیں رہ جاتے، اُن کی نگاہ ہمیشہ مستقبل پر ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ بیسویں صدی کے سب سے بڑے قائد، قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت میں موجود تھا کیونکہ اُس کا ہادیِ اکبرؐ انسانیت کی کایاپلٹ کا مظہر تھا، وہی اس کا آئیڈیل تھا اور ملجا و ماویٰ تھا جسے یہ مل گیا اُسے اور کیا چاہیے۔

آگے چل کر قائداعظم فرماتے ہیں:

''تم آزاد ہو، تم مندر جانے میں آزاد ہو، تم مسجد جانے کے لئے آزاد ہو، جو بھی آپ کی عبادت گاہ ہو آپ وہاں جا سکتے ہیں آپ کا کوئی بھی مذہب ہو یا ذات پات ہو، اس کا ریاستی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ذات پات، رنگ یا برادری کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہم اس بنیادی اصول کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ہی ریاست کے برابر کے شہری ہیں۔ یہ ہمارا آئیڈیل ہے اور ہمیں اپنا آئیڈیل اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں ہندو، ہندو نہیں رہ جائے گا اور مسلمان، مسلمان نہیں رہ جائے گا، مذہبی معنوں میں نہیں، وہ بات اپنی جگہ قائم و دائم رہے کیونکہ مذہب ہر ایک کا نجی معاملہ ہے میں یہ بات سیاسی طور پر ایک مملکت کے شہری کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ میری راہنمائی ہمیشہ انصاف اور احسان کے اعلیٰ واضح اصول کریں گے، جسے سیاسی لغت میں بلا تعصب و بدنیتی یا دوسرے الفاظ میں بلا طرف داری و بلا جانب داری کہتے ہیں۔ اگر ہم نے ان ارفع اعلیٰ اصولوں کو اپنا مطمعِ نظر بنایا تو آپ دیکھیں گے پھر پاکستان دنیا کی بہت بڑی قوموں میں سے ایک بنے گا۔''

سردار محمد چوہدری لکھتے ہیں کہ آپ حیران ہوں گے کہ اس تقریر کی تمام روح دنیا کے سب سے پہلے تحریر شدہ دستور یعنی میثاقِ مدینہ سے ماخوذ ہے۔ محمد علی جناح اپنے مشکل سے مشکل فیصلوں میں اس چشمۂ ہدایت سے راہنمائی لیتے تھے۔ آپ حضورؐ نے بھی مدینہ ہجرت کے بعد جب وہاں کے تمام قبائل بشمول یہودیوں کے ساتھ امورِ ریاست کو چلانے کا چارٹر ترتیب دیا تو اس دستور سے منسلک تمام فریقوں کو اس ریاست کے برابر کے شہریوں کا درجہ دیا اور اُن کے معاملات کو اُن کی شریعت کے مطابق طے کرنا قبول فرمایا، یہاں تک کہ اُن کی قبائلی رسوم کو بھی، جو اسلام سے متصادم نہیں تھیں، کو قبولیت بخشی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی پہلی تقریر میں ان بہت سے مسائل کی گتھیاں عین اسلام کے مطابق سلجھادیں۔ یہ ان کی عظمت کا ایک بڑا ثبوت ہے۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ ہمارے ملک کے موجودہ حالات ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ یہ سب پریشانیاں ہماری خود ساختہ ہیں۔ قائد کے اصولوں سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج بھی قوم یکجہتی کا دامن تھام لے تو تمام مسائل رفتہ رفتہ حل ہوجائیں گے۔ قوم کی یکجہتی اتنی بڑی طاقت ہے کہ بڑی سے بڑی مشکل کو صبر وتحمل سے برداشت کرکے کامیابی سے ہمکنار کرسکتی ہے۔

قوموں کی تاریخ میں 65 رسال کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن ہم نے ان 65 رسالوں میں اتنے فریب کھائے ہیں کہ ہمیں اتنا سبق حاصل ہوجانا چاہیے کہ پوری قوم کب تک معدودے چند خودغرض افراد کے ہاتھوں کھلونا بنی رہے گی۔ قوم کو بیدار ہوکر عملی ثبوت دینا چاہیے، عوام طاقت کا وہ سرچشمہ ہیں جنہیں انصاف مل جائے تو یہ ملک کی تقدیر بدلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ عوام بہتر مستقبل کے لئے امن کے خواہاں ہیں اور امن بحال کرنے کے لئے صرف اور صرف قانون کی بالادستی درکار ہے۔

آج سے 35 رسال قبل میں نے پانچ سال یو۔اے۔ای میں گزارے۔ یوں کہوں گا کہ UAE میرے سامنے معرضِ وجود میں آیا۔ ورنہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں یہ مقام حاصل نہ کرپاتیں جہاں آج ہیں۔ اُن پانچ سالوں میں ایک چوری کی واردات اور ایک قتل کی واردات شنید میں آئی، کیوں؟ اس لئے کہ وہاں قانون کی بالادستی ہے۔ غلطی کرنے والا کوئی بھی ہو، اُسے اُس کی سزا دی

جاتی ہے۔ وہاں مراعات، تعلق داری، سفارش کا کوئی خانہ نہیں۔ انہوں نے تعلیم پر توجہ دی، اُستاد کو اتنی مراعات دیں کہ وہ فطری طور پر چاہے گا کہ میں اپنے طالب علموں میں تمام صلاحیتیں سمو دوں۔ طالبِ علموں کو اتنی سہولت اور وظائف کہ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی بچوں کو اسکول بھیجنے پر مجبور بلکہ خواہاں کہیے۔ پھر آپ نے دیکھا کہ انہوں نے کیا مقام حاصل کیا۔ وہ تجارت کا ایک بڑا مرکز بن کر دوسروں کے لئے مثال ہے۔ عوام حکومت سے صرف انصاف، تعلیم اور صحت کی درخواست کرتے ہیں، یہ میسر ہوں تو ہمارا ملک قائداعظم کے ان الفاظ کا ترجمان ہوگا:

"آپ دیکھیں گے کہ پھر پاکستانی دنیا کی بہت بڑی قوموں میں سے ایک بنے گی۔"

اب وقت کا تقاضا ہے کہ ہم قائداعظم کے ارفع واعلیٰ اصولوں کو آج بھی اپنا مطمعِ نظر بنالیں تو ہمارے عوام میں بڑی صلاحیتیں ہیں انہیں مواقع فراہم کیے جائیں، اداروں کی مضبوطی ہی قوموں کو مثالی بناتی ہے۔ اس میں قباحت کیا ہے سب کچھ ہمیں بتایا گیا ہے، سب کچھ ہمارے سامنے ہے پھر ہم ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے سے کیوں گریزاں ہیں۔

آج سے قائداعظم محمد علی جناح کے فرمودات پر عمل شروع کر دیجئے اور چند ہی دنوں میں ملک کا نقشہ بدلنا شروع ہو جائے گا۔ اس میں مرکزی کردار عدالتی نظام کا ہے۔ عدالتی نظام ہی نے اپنا فرضِ منصبی بجا طور پر ادا کرتے ہوئے ڈوبتے ہوئے برطانیہ کو نئی زندگی دی۔ امید واثق ہے کہ قائداعظم کے اصولوں پر گامزن ہو کر ہم جلد اپنی کوتاہیوں کا ازالہ کرلیں گے، جو دشواریاں درپیش ہوں گی اُسے قوم خندہ پیشانی سے برداشت کرے گی اور ملک عظمتوں کی سرحدوں کو چھولے گا۔ صرف ادارے بلاتفریق رنگ ونسل اپنے فرائض انجام دیں اور بس۔

☆......☆......☆

لکھنؤ کے تاریخی اجلاس کا خطبۂ صدارت (15 اکتوبر 1937ء)

"لیکن سوال یہ ہے کہ حقِ رائے دہی بالغان کی بنا پر حلقہ ہائے انتخاب کو متعین کون کرے گا اور اس بنا پر متعین شدہ حلقہ ہائے انتخاب نمائندوں کی کس قدر تعداد کو منتخب کریں گے اور ایسے حلقہ ہائے

انتخاب میں اقلیتوں کا حشر کیا ہوگا، اور حلقہ ہائے انتخاب کے اندر یہ شعور کیوں کر پیدا ہو سکے گا کہ اُن کو اس وسیع وعریض ملک کے دستور مرتب کرنے والی جماعت کو کس طرح منتخب کرنا چاہیے اور جماعت بھی وہ جس کو ترتیبِ دستور کا کلی اختیار حاصل ہوگا؟ اس مشینری کو کون چلائے گا جو اس مخصوص جماعت کو انتخاب کرے گی، جس کو اپنی مرضی کے مطابق تشکیلِ دستور کا اختیار حاصل ہوگا؟ اور انجام کار یہ کہ اس جماعت میں اقلیتوں کی حیثیت کیا ہوگی؟ کانگریس کو واقعی یہ یقین ہے کہ وزیرانِ ہند تمام مطالبات اور ضروریات کو پورا کردیں گے۔ حالانکہ ابھی چند روز ہوئے کہ ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے سب سے بااختیار اور بڑے نمائندے یعنی ایکسی لنسی وائسرائے نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ہندوستان کو مستقبل قریب میں فیڈریشن حاصل ہوجائے گی اس کے علاوہ جب یہی وائسرائے ہندوستان آیا تھا تو اس نے اس خیال کا برملا اظہار کیا تھا کہ فیڈریشن کی اسکیم بحیثیت مجموعی اس قدر اچھی ہے کہ صوبہ جاتی آئین کے نفاذ کے بعد یہ بہت جلد رائج ہوجائے گی اور اب گزشتہ ڈیڑھ برس کے تجربے نے اس کے اس یقین کو اور بھی پختہ اور مستحکم کردیا ہے اور اُس کو یہ یقین ہے کہ ایک معقول عرصے کے اندر فیڈریشن قائم ہوجائے گی۔

اگر ملک کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کیا جائے تو تاحال کانگریس اس قابل نہیں کہ وہ عنانِ نظم ونسق سنبھال سکے اور یہ حقائق کی دلچسپ تضحیک ہے کہ حکومت برطانیہ سے یہ توقع کی جائے کہ وہ دستوری اسمبلی قائم کرے گی اور جہاں تک کانگریس کا سوال ہے وہ اس صلاحیت سے قطعی طور پر بے بہرہ ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ کانگریس سب سے پہلے ملک کی تمام قابلِ ذکر جماعتوں اور مفادوں کو یکجا کرکے

اپنے سائے تلے لے آئے ورنہ ایک غیر ملکی حکومت سے جو اس وقت ملک کے اندر صاحبِ اختیار ہے یہ مطالبہ کرنا وہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل یا تمام جماعتوں کی طرف سے کانگریس کے اقتدار کے اقرار کے بغیر کوئی ایسا قدم اٹھائے گی بعینہٖ ایسا ہے جیسا کہ گاڑی کو گھوڑے کے آگے کھڑا کر دیا جائے اور اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان ایک تہائی ہندوستانی ریاستوں اور والیانِ ریاست پر مشتمل ہے اور اُن کا نقطۂ نگاہ بالکل مختلف ہے۔ بے کار کوششوں کی بجائے بہتر یہ ہے کہ کانگریس پوری یکسوئی کے ساتھ اس بات کو سمجھ لے کہ گورنمنٹ انڈیا ایکٹ 1935ء میں جو فیڈرل اسکیم پیش کی گئی ہے وہ رائج الوقت آئین کے مقابلے میں بدرجہا رجعت پسندانہ ہے۔ اس لئے اس کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں کی طرف سے اس کے نفاذ کے متعلق جو دعوے کئے جارہے ہیں ان کو عملی جامہ پہننے نہ دیا جائے۔ اس باب میں کانگریس کیا کر رہی ہے؟ کیا اُس کا یہ خیال ہے کہ وہ تنہا آپ پارٹی کی حیثیت سے اس کے نفاذ کو روک دے گی۔ یا کوئی اور فارمولا بنالیا جائے گا اور کانگریس اُس کو بھی صوبہ جاتی آئین کی طرح اپنے سرکردہ لیڈروں کی مبالغہ آرائی کے باوجود قبول کرلے گی۔

اب میں مسئلۂ فلسطین کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کا تمام مسلمانانِ ہند پر نہایت گہرا اثر پڑا ہے، حکومتِ برطانیہ کی عام پالیسی یہ ہے کہ اُس نے شروع سے لے کر آخر تک عربوں کو دھوکا دیا ہے۔ برطانیہ نے اپنے اُس وعدے کو پورا نہیں کیا، جو جنگِ عظیم کے دباؤ کے تحت کیا گیا تھا اور جس میں یہ کہا گیا تھا کہ عربوں کو مکمل آزادی کی گارنٹی دی جاتی ہے اور ایک بین العرب وفاق کی تشکیل کا اعلان کیا جاتا ہے۔ عربوں کی سریع الاعتقادی سے پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ عربوں

سے جھوٹے وعدے کر کے اُن کو استعمال کرنے کے بعد برطانیہ بدنامِ خلائق اعلان بالفور (لارڈ بالفور نے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے پہلی جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد گزشتہ مواعد کے برعکس فلسطین کو وطن الیہود بنانے کا اعلان کیا تھا) کے ذریعے سے اپنے آپ کو اُن پر مسلط کر دیا، اور یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن بنانے کی پالیسی کے بعد اب برطانیہ فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اور رائل کمیشن کی سفارشات نے اس المناک داستان کا آخری باب لکھ دیا ہے۔ (اس رائل کمیشن نے تقسیمِ فلسطین کی سفارش کی تھی) اگر اُس کو نافذ کر دیا گیا تو عربوں کی اپنے وطن میں اُن تمام تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہو جائے گا اور اب ہمیں یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم اصل واقعات پر غور کریں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ حالات پیدا کس نے کئے ہیں؟ یہ برطانوی مدبرین کی پیداوار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جمیعۃ الاقوام رائل کمیشن کی سفارشات کی تائید نہیں کرے گی اور خدا کرے اُن کی تائید نہ کی جائے اور اصل حالات کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عربوں کو اُن کا صلہ دینے کے لئے یہ کوئی دیانت دارانہ کوشش ہے؟ میں حکومتِ برطانیہ کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر اس نے مسئلۂ فلسطین کا جرأت، دلیری، اور انصاف کے ساتھ فیصلہ نہ کیا تو یہ حکومتِ برطانیہ کی تاریخ میں ایک جدید انقلاب کا دروازہ کھول دے گا۔ میں صرف مسلمانانِ ہند کی نہیں بلکہ اس معاملے میں مسلمانانِ عالم کی ترجمانی کر رہا ہوں اور تمام انصاف پسند اور فکر مند اصحاب اس بات میں میری تائید کریں گے۔ جب میں یہ کہوں گا کہ اگر برطانیہ نے اپنے ان مواعید، عزائم اور اعلانات کو جو زمانہ قبل و بعد از جنگ تمام دنیا کے روبرو غیر مشروط طور پر عربوں کے ساتھ کئے گئے تھے پورا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود رہا ہے۔

میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ عربوں کے اندر نہایت شدید احساس پیدا ہو چکا ہے اور حکومتِ برطانیہ جھلا کر اور جوش میں آ کر اعرابِ فلسطین کے خلاف نہایت سخت تشدد کے استعمال پر اُتر آئی ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان عربوں کے اس منصفانہ اور جرأت مندانہ جہاد میں اُن کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے میں اُن کو یہ پیغام بھیجنا چاہتا ہوں اس منصفانہ جنگ میں وہ جس عزم، ہمت اور حوصلے کے ساتھ لڑ رہے ہیں وہ انجام کار کامیاب ہو کر رہیں گے۔

میں ہندوستان کے ہر شہر، تحصیل، ضلع اور صوبے کے مسلمانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ عوام کی بہبود وفلاح کے لئے تعمیری اور ترقی پسندانہ پروگرام بنائیں اور مسلمانوں کی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی ترقی کے لئے مناسب ذرائع اور وسائل اختیار کریں۔ میں ملک یا صوبوں کی فلاح وترقی کے لئے کام کرنے والی جماعتوں کے ساتھ تعاون سے قطعاً گریز نہیں کرتا میں آپ حضرات سے یہ درخواست اور اپیل کرتا ہوں کہ تمام مرد، عورتیں اور بچے آل انڈیا مسلم لیگ کے متحدہ پروگرام اور جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ ڈسٹرکٹ پراونشل اور آل انڈیا مسلم لیگ میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں بہت جلد بھرتی ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو منظم کر کے اپنے اندر وحدتِ مقصد وخیال پیدا کرو اور اپنے آپ کو تربیت یافتہ اور ضبط آشنا سپاہیوں کی طرح آراستہ کر لو۔ اپنے اندر اخوت ورفاقت کے جذبات پیدا کرو، اپنے ملک وقوم کے لیے وفا اور دیانت داری کے ساتھ بےلوث قربانیاں دیا کرو، صنعت ومشقت اور قربانی کے بغیر کوئی فرد اور کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ ملک کے اندر اس قسم کی طاقتیں موجود ہیں جو تمہیں پریشان اور سرگرداں کریں اور تمہیں ہر قسم کی مشکلات کو برداشت کرنا پڑے اور انہی قربانیوں اور آگ کے امتحان سے نکل کر

آپ اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اور اس طرح اپنے معتقدات وعزائم پر سختی کے ساتھ قائم رہ کر ہی کوئی قوم اپنی سابقہ شان دار روایات کو برقرار رکھ سکتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جو تاریخِ عالم میں ہندوستان کے نام کو روشن کر سکتی ہیں۔''

لکھنوٴ کے تاریخی اجلاس کا خطبہٴ صدارت جو 15 راکتوبر 1937ء کو قائدِاعظم نے اپنے خطاب میں جو کچھ کہا، وہ ابھی باقی ہے میں درمیان میں پاکستان کے غیور عوام سے ملتجی ہوں کہ اسے ذرا غور سے پڑھیں آج سے 74 رسال قبل کے قائد کا خطاب ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر قائد ہمارے سامنے کھڑے ہم سے مخاطب ہیں۔ ہم اپنی کوتاہیوں پر شرم سار اور قائد کی بالغ نظری کے قائل تو ہیں لیکن اُس پر عمل پیرا ہونے کی صورت تلاش کرنے سے کیوں قاصر ہیں؟ قوم کے ہر فرد کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے، وقت پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ قومی یکجہتی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ذاتی مفادات اور عناد کے خول سے باہر نکل کر خلوص نیت سے ملک وقوم کی تعمیر کی جائے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم آزاد ہو کر بھی غلاموں کے طور زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس خطاب کو پڑھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ قائد کی روح ہم سے مخاطب ہے۔

ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو خائف ہونے کی ضرورت نہیں، اُن کی تقدیر اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ ایک متحدہ ٹھوس اور منظم طاقت کی حیثیت سے ہر خطرے اور ہر مزاحمت کا متحدہ محاذ کے ذریعہ سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

تمہارے اپنے ہاتھوں میں ساحرانہ قوت موجود ہے۔ اب تمہیں اپنے اہم فیصلوں پر ڈٹ جانا چاہیے۔ یہ نہایت اہم، ضروری اور نتیجہ خیز ہیں۔ کسی فیصلہ سے قبل ایک ہزار بار غور کرو لیکن جس وقت کوئی فیصلہ ہو جائے تو اُس پر شخصِ واحد کی طرح جم جاوٴ۔ آپ کو صداقت شعار اور وفادار رہنا چاہیے۔ بس اس کے بعد کامیابی اور فتح آپ کے قدم چومے گی۔''

قائداعظم نے ہمیں جن راہوں پر گامزن ہونے کی تلقین کی اُن پر عمل پیرا ہو کر ہم نے دس سال بعد 1947ء میں ایک علیحدہ مملکت پاکستان حاصل کرلی۔ یہ سنجیدہ اور صاحبِ نظر، صاحبِ فکر قیادت ہی کا کمال تھا کہ ہم نہ صرف ہندوؤں کی بالادستی سے محفوظ ہو گئے بلکہ ہم خطۂ آزاد میں سانس لینے لگے۔

پاکستان حاصل کرنے کے بعد ہم کامیابیوں کی ترقی پر کیا گامزن نہ ہو سکے، ان میں عوام کا نمبر بعد میں آتا ہے پہلے نمبر پر قیادت ذمے دار ہے۔

ہم قائداعظم کے فرمودات سے انحراف کے صلے میں اور قیادت کے فقدان کے صلے میں آج مشکل سے مشکل حالات سے نبرد آزما ہوتے جا رہے ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہماری قیادت سنجیدگی کا مظاہرہ کرے اور ملک کو قائداعظم کے خوابوں کی تعبیر بنائے۔

☆......☆......☆

قائداعظم نے جب ہمارا مقدمہ لڑا۔ اُس وقت حالات اس قدر دگرگوں تھے کہ اُن سے نبرد آزما ہونے میں بڑے بڑوں کو دانتوں پسینہ آجاتا تھا۔ قائداعظم بذاتِ خود بھی دل برداشتہ ہوئے لیکن اُن کے اندر جو جذبۂ ملی کارفرما تھا اُس نے انہیں خاموش نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو ہندوؤں اور فرنگی شاطروں کے پنجے سے آزاد کرانے کے لئے پھر میدانِ عمل میں اُتر آئے نہ صرف اُتر آئے لیکن اپنی مقصد سے بھرپور زندگی کو عملی جامہ پہنا کر کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے۔ ہمیں آزاد مملکت پاکستان کا تحفہ دے کر یہ ثابت کردیا کہ قیادت دیانت دار ہو تو کامیابیاں قدم بوس ہو جاتی ہیں۔

بات ہو رہی تھی پاکستان کو حاصل کرنے کے لئے قائداعظم کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا، اور قائداعظم نے کس طرح قوم کو متحد کر کے نہ صرف کانگریس بلکہ برطانیہ کو بھی سرنگوں کیا۔ اُس برطانیہ کو جس کی حکومت میں کبھی سورج غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ آج ناگفتہ بہ حالات میں جو مصائب ہماری کامیابیوں کی راہ میں حائل ہیں وہ اُن حالات کا پاسنگ بھی نہیں۔

ہماری اصلاح تاریخ کی ورق گردانی ہی میں نہیں بلکہ اُس سے سبق حاصل کرنے میں ہے،

بات ہو رہی تھی 1937ء اب ہم 5رفروری 1938ء کی طرف آتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں قائداعظم کی تقریر:

''جنابِ صدر! آپ نے کہا کہ مسلمان آزاد پیدا ہوتا ہے، وہ کب آزاد تھا؟ کم از کم اس ملک میں ہم ڈیڑھ سو سال سے غلام ہیں۔ میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ مسلم نوجوان ادراک بہری سے استفادہ کرنے پر تیار ہے۔ محض ہو حق اور نعروں کی بجائے عملی ذمے داریوں کو وہ محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ قائد اعظم نے میثاقِ لکھنؤ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے اس کے لئے کیا مساعی کی تھیں اور کانگریس سے کس قدر قریبی تعاون کیا تھا۔ آپ نے بتایا کہ مسلمانانِ ہند آزادی کی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ کامل حکومت خود اختیاری کی تمناؤں میں کانگریس سے ان کا کوئی اختلاف نہ تھا، اُس کانگریس اور لیگ دونوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دستور میں، وہ جس قسم کا بھی ہو اور جس کسی کا مدون کیا ہوا ہو، تمام اقلیتوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ گول میز کانفرنس کے انعقاد تک ہندو مسلم سوال کے حل کی متعدد کوششیں کی گئیں۔ نامعلوم اس وقت میری خودداریوں کو کیا ہوگیا تھا کہ میں کانگریس کے سامنے ہاتھ پھیلایا کرتا تھا۔ میں نے اس مسئلے کے حل کے لئے اتنی انتھک اور مسلسل کوششیں کیں کہ ایک روزنامے نے اس پر لکھا ''مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے سوال سے کبھی بیزار نہیں ہوتے لیکن گول کانفرنس کے اجلاس میں مجھے اپنی زندگی کا سب سے بڑا دھچکا لگا ہے، خطرہ نمودار ہوتے ہی ہندو دل و دماغ، ہندو جذبات اور ہندو روش نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ بالآخر اتحاد کی توقع ہی اُٹھ گئی۔

اُس وقت میرے احساسات پر قنوطیت چھائی ہوئی تھی، میرے جذبات پر مایوسیاں منڈلا رہی تھیں۔ میں اپنے ملک سے ناامید ہو گیا تھا۔ صورتِ حال بہت ہی بد بختانہ تھی۔ مسلمان بے یارومددگار تھے اُن کا کوئی پوچھنے والا ہی نہ تھا کبھی تو دولتِ برطانیہ کے کاسہ لیس اور خوشامدی اُن کی قیادت کرتے تھے اور کبھی کانگریس کے ''معتقد چاکر'' اُن کی رہنمائی کا دم بھرتے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں نہ ہندوستان کی مدد کرسکتا ہوں، نہ ہندو ذہنیت کو بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا یقین دلاسکتا ہوں۔ کیونکہ جب کبھی مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی جاتی تو ایک طرف ٹوڈی اور خوشامدی اور دوسری طرف کانگریس چھاؤنی کے غدار ایسی کوششوں کو بے اثر کردیتے تھے۔ احساسِ پستی اس قدر بڑھا کہ میں نے لندن ہی میں اقامت گزینی کی ٹھان لی۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اپنی بے چارگیوں کا احساس ہو گیا تھا، تاہم میں نے ہندوستان سے برابر رابطہ رکھا۔ پورے چار سال بعد آخر میں، میں نے دیکھا کہ مسلمان شدید خطرے میں ہیں میں لندن میں بیٹھا ہوا ان کی بہبود کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا اس لئے میں نے ہندوستان واپس آنے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن میں بے یارومددگار تھا۔ میری حیثیت ایک بے بلائے مہمان کی سی رہ گئی تھی اور میرے ساتھ سلوک ہی ایسا کیا گیا جس کا ایک بن بلایا مہمان مستحق ہوتا ہے۔

بہرحال 1935ء میں، میں نے صوبہ داری انتخابات کے سلسلے میں صدرِ کانگریس سے گفت وشنید کی، اس نتیجے کے طور پر ایک ضابطہ (فارمولا) مرتب ہوا۔ لیکن ہندوؤں نے اُسے ناپسند کیا۔ 1936ء میں، میں نے کانگریس سے اپیل کی کہ ''جو کچھ ہوا سو ہوا'' اب فرقہ وار عطیہ کی تلخ بحثوں کو ختم کردو، یہ اچھا یا برا جیسا بھی ہوا اُسے یوں

ہی رہنے دو تا آنکہ ہم ایک متفقہ حل نہ دریافت کر لیں۔ اب ہمیں اس سے اہم امور کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ حصول اتحاد کے سارے طریقے اپنائے جا چکے ہیں تو میں نے مڑ کر حالات کا جائزہ لیا کہ وہ کس امر کے متقاضی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ ادھر تو جدید دستور کی آمد آمد ہے۔

اور یہاں 1924ء سے 1936ء تک ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ مایوسیوں نے مجھے اور بے باک کر دیا، اور میں نے اپریل 1936ء کو کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا اس میں یہ طے ہوا کہ صوبہ داری انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ ہر سمت اس فیصلہ کی مخالفت ہوئی نہ صرف کانگریس بلکہ بہت سے ''اپنوں'' نے بھی اس کی مخالفت کی۔ ابتدائی تنظیمی اداروں کے بغیر انتہائی بے سروسامانی اور ناکافی وسائل کے باوجود اس انتخابی مہم میں لیگ کو ایک معقول حد تک کامیابی ہوئی۔ ہماری اکثریت کی بعض صوبوں کی مجالس آئین ساز میں مسلم لیگ کی جماعتیں تک نہ تھیں، بہر حال 1936ء سے ہم نے عزم و استقلال کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے نتائج حیرت انگیز نکلے۔''

آیئے اب ہم اپنی حیثیت پر پھر ایک دفعہ نظر ڈالیں، سب سے پہلے تو دفتری زبان اور نوکر شاہی مزاج کو لیجئے۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اُن کو مسلمانوں پر تصرف قدیم کی بنا پر ایک حق حاصل ہے وہ کہتے تھے کہ ''اگر جناح دخل انداز ہوا تو مسلمان ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔'' اور ہوا بھی یہی! خدا کا شکر ہے کہ مسلمان آج اُن کی دسترس سے باہر ہیں۔ لیکن اب اختیارات ایک حد تک فرقہ اکثریت کے ہاتھ میں منتقل ہو گئے ہیں:

''یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ حکومتِ برطانیہ اب مسلمانوں کی دستگیری پر مائل نظر نہیں آتی۔ بلکہ انہیں بھیڑیوں کے آگے

ڈال رہی ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے۔ مسلم لیگ نے بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو برطانوی راج کے پنجے سے چھڑا لیا ہے۔ لیکن ایک اور طاقت سامنے آئی ہے جس کا ادعا ہے کہ وہ حکومتِ برطانیہ کی جانشین ہے۔ آپ اس کو جس نام سے چاہیں پکاریں وہ اصل میں ہندو اور ہندو راج ہے۔ سیاسی بولی میٹھی تو ہوتی ہے مگر گمراہ کن! اس لئے میں سیدھی سادی زبان میں گفتگو کروں گا۔ کانگریس کی روش کیا ہے؟ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''مسلم لیگ ٹوڈیوں پر مشتمل ایک رجعت پسند جماعت ہے اور برطانوی شہنشاہ کی معاون ہے۔'' یوں لیگ کو قابلِ ملامت قرار دیا گیا۔ خیر! مسلم لیگ نے کیا کیا؟ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ حالاتِ حاضرہ کے مدِ نظر صوبہ جاتی دستور سے بقدر افادیت استفادہ کیا جائے اس کے برعکس کانگریس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس دستور کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ لیگ نے ایک نہایت پرجوش قومی نظامِ عمل منظور کیا تھا۔ لیکن کانگریس نے ذرا بھی صبر سے کام نہ لیا۔ ہم اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ لیگ کو مسلمانوں کی کامل نمائندہ جماعت بنایا جائے لیکن کانگریسی پریس میری غلط تعبیریں کر رہا تھا۔ مجھ پر تہمتیں تراش رہا تھا۔ انہوں نے مجھے فرقہ پرست کا خطاب دیا وہ کہا کرتے تھے کہ خیر جناح سچے ہوں تو ہوں لیکن اُن کے اطراف ایسے ٹوڈی اور خوشامدی ہیں کہ ایک دن انہیں نگل جائیں گے۔ وہ مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کے لئے ہر موقع پر ایک نہ ایک بہانہ تراش لیا کرتے تھے کانگریس نے ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ کو زہر آلود کرنے کی کوشش کی اور انہیں ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ سمجھنے لگے کہ واقعی کانگریس آزادیٔ کامل کی طلب گار ہے اور وہ افلاس اور فاقوں کا خاتمہ کر دے گی۔'' لیکن درحقیقت کانگریس کا مقصد کیا تھا؟ وہ حکومتِ برطانیہ

سے بعض عہد و پیمان کرنا چاہتے تھے۔ جس میں انہیں کامیابی ہوئی اب وہ اسی دستور سے نہ صرف استفادہ کر رہے ہیں بلکہ اس پر پوری طرح عمل پیرا ہیں۔ جس کو تباہ کر دینے کا انہوں نے بڑی شد و مد سے دعویٰ کیا تھا۔

مسلمانوں کو بھی انہوں نے طرح طرح کی احمقانہ ضمانتیں دیں ایک صوبہ میں تو ایک کانگریسی وزیر نے تو یہاں تک کہہ دیا "اگر کسی نے کسی مسجد کی ایک اینٹ کو چھیڑا تو اپنی جانِ عزیز قربان کر دیں گے۔" یہ بڑی شریف النفسی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں کیا ہوا؟ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلے انتخاب میں ایک مسلمان بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ہم ضمانتوں اور خیر اندیشوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ دنیائے سیاست میں خیر اندیشی، الفت، محبت اور پاسِ خاطر اسی وقت ہوگا جب آپ طاقت ور ہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ آپ کی کمزوریوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ آپ کی قوت و توانائی سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ جب تمہیں فاقہ و افلاس کی دل خراش داستانیں سنائی جائیں، جب تم سے کہا جائے کہ آؤ اس دردناک حالت کو بدل دیں! کانگریس حصولِ آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے، ایک اشتمالی اور اشتراکی حکومت کے لئے لڑ رہی ہے۔ اقتصادیات ہی وہ مسئلہ ہے جس سے ہم دوچار ہیں تو یقیناً تم مضطرب ہو جاؤ گے، مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات خود میرا دل دہل گیا، غرض ایسی باتوں سے ہمارے نوجوانوں کے کان مسلسل بھرے گئے۔"

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں 5 رفروری 1938ء کو قائد اعظم کی، کی جانے والی تقریر کو اگر ملک کی موجودہ صورتِ حال میں دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ عوام آج بھی انہی حالات سے دوچار ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے مدِ مقابل کانگریس و حکومتِ برطانیہ تھی بلکہ کچھ مسلمان بھی، آج عوام بلکہ 98% عوام اور مقابل میں جاگیردار،

وڈیرے، صنعت کار، سردار۔ پسِ پشت آج بھی وہی برطانیہ اور اضافی امریکا۔ عوام کو بے خوف ہو کر جمہوریت کی بقا کی جنگ لڑنا ہوگی، وہ جماعتیں جو حقیقت میں عوام کی نمائندہ ہیں انہوں نے ان تین عشروں میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ عوام ہی سب سے بڑی طاقت ہیں۔ الیکشن قریب ہیں، جمہوری طریقۂ کار پر کاربند رہتے ہوئے موجودہ حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے دی جائے۔

بصورت دیگر عوام اور سیاست دان جمہوریت روایتی دراڑ کے لئے ذہنی طور پر تیار رہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ جماعتیں دراصل 98% عوام کی نمائندہ ہیں، اگر اُن میں کسی مرحلے پر نظریاتی اختلافات ہیں تو وہ گفت وشنید سے ہم آہنگی پیدا کریں۔ قومی یکجہتی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تحمل، برداشت و مفاہمت کی سیاست ملک کو اندرونی اور بیرونی دباؤ سے بخوبی نکالنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس وقت قوم میں جو جوش اور ولولہ ہے وہ آنے والے وقت کے لئے ایک خوش آئند نوید ہے۔ جو اَناؤں کے خول میں سیاست کرتے رہے ہیں ملک کی سالمیت کے لئے، ملک کی ترقی کے لئے، ملکی معیشت کو نئی زندگی دے کر ملک کو مثالی اور آزاد مملکت بنانے کے لئے سنجیدگی سے غور کریں۔ اُس قہر سے بچیں جب لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس سے آمروں کا دور بہتر تھا جس کے دوررس نتائج بہت خطرناک ہوتے ہیں۔

میرے لئے خوش آئند بات یہ ہے کہ آج ملک کے نوجوان ملک کے سیاست دانوں کے ہتھکنڈوں کو بہت کچھ کھو کر بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ فاقوں اور افلاس کا علاج تقریروں میں نہیں عمل میں ہے اور عمل کا یہاں فقدان ہے۔ وہ اس لئے جس نے مشکل وقت دیکھا ہی نہ ہو وہ مشکل اور پریشانی کو کیا سمجھے۔ یہاں تو اس طور بات کی جاتی ہے کہ ایک وڈیرے، جاگیردار، جو صوبہ سندھ کی اعلیٰ ترین کرسیوں پر فائز رہے ان کا کہنا ہے کہ ہم یا ہمارے جیسے لوگ حکومت کرنے کے لئے ہوتے ہیں اور ایک طبقہ خاص صرف اور صرف مزدوری یا باالفاظِ دیگر جی حضوری کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ جہاں فکر کے یہ تیور ہوں، وہاں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ تبدیلی آیا چاہتی ہے۔ عوام کی طاقت، ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے، تاریخ اس کی گواہ ہے۔ وہ کل کی ہو یا آج کی۔

☆......☆......☆

تقریر اور عمل دو مختلف اوصاف ہیں۔ خوب تر مقرر لہجہ کے اُتار چڑھاؤ سے الفاظ کے زیروبم کے ساتھ موضوع کی مناسبت کے پیشِ نظر سامعین وناظرین کے جذبات سے کھیلنے والے کو عرفِ عام میں اچھا مقرر تصور کیا جاتا ہے جس کی تاثیر وقتی اور عارضی ہوتی ہے۔ جوشِ خطابت سے وصول کی جانے والی داد، عارضی جذباتی لگاؤ کے زمرے میں آتی ہے۔ حقیقی تعبیروں کا اُس میں دور تک عکس نظر نہیں آتا۔ صاحبِ عمل اور صاحبِ کردار مقرر کی تقریر جس مقصد خاص کے لئے کی جاتی ہے وہ دلائل وحقائق کی روشنی میں صادق آتے ہوئے ذہنوں کو متاثر کرتی ہوئی دلوں میں اُتر جاتی ہے۔ آج کل ملک میں تقریری مقابلوں کا موسم شباب پر ہے۔ جس میں مختلف نکتۂ نظر کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے تقاریر کی جاتی ہیں۔ اس کی کامیابی اور ناکامی کے نتائج کا اندازہ سامعین کے اجتماع سے نہیں لگایا جاسکتا اور جہاں تقریروں کے پسِ پشت مصلحتوں کے سہارے ہوں وہاں تو منصفوں کے لئے بھی فیصلہ کرنا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

بالخصوص سیاسی ماحول استوار کرنے کے لئے یا اپنا نکتۂ نظر بیان کرنے کے لئے سامعین کے اجتماع کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اُس اجتماع میں بالغ نظر اور سنجیدہ ذہن کے مالک لوگوں کی تعداد کتنی ہے۔ کسی بھی ملک کی تقدیر بدلنے کے لئے صرف پانچ فیصد باشعور طبقہ کافی ہوتا ہے جس کا نظامِ حکومت میں عمل دخل ہو اور یہ سب کچھ بھی اُس وقت فیصلہ کن مراحل میں داخل ہوتا ہے کہ انتخابات شفاف طریقۂ کار سے کرائے جائیں۔ بصورتِ دیگر جس سانحے سے قوم گزر رہی ہوتی ہے دوبارہ اسی دلدل میں کسی طور سے پھنسی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہاں اگر انتخابات شفاف بھی ہوں تو اتنی گنجائش پھر بھی باقی رہتی ہے ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے مگر بہت مختصر جو جیت کے آثار کو پیشِ نظر رکھ کر اپنا ووٹ دیتا ہے۔ قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں ایک تو وہ ووٹر جو ووٹ کی قدر و منزلت بھی سمجھتے ہیں اُس کے باوجود بھی ان کا فیصلہ حقیقی نظریات کے خلاف شخصیات یا ذاتی مفادات کے پیشِ نظر ہوتا ہے جہاں ایسا نہیں ہوتا، نادیدہ طاقتوں کا دباؤ عوام کے حق ارادیت کو تبدیل کرا لیتا ہے۔ ملک میں یہ کھیل 65 رسال سے کھیلا جارہا ہے۔ اور ملک کی تنزلی کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے جو قوم اپنے راہبر کے صائب مشوروں و نصیحتوں پر عمل نہیں کرتی

ذلت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ ہم اُس پر غور وفکر نہیں کرتے کہ ہمیں ہر دو سے دو چار ہونے کے لئے راہوں کا تعین کر کے دیا گیا ہے۔ جب ہم اُن پر عمل پیرا نہیں ہوں گے ہمیں کچھ میسر نہیں آئے گا۔ اس سے پہلے ہم قائداعظم کی اس تقریر کو نقل کر رہے تھے جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں کی تھی۔ اُسے آگے لے چلتے ہیں۔ آپ (قائداعظم) فرما رہے تھے:

''جب تمہیں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ تم ایک ہی وار میں حکومتِ برطانیہ، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کر سکو گے تو یورپ کے حالات پر نظر ڈالو۔ جرمنی میں تثلیثیت کے قیام کے باعث اشترا کی اور اشتمالی تحریکات ہی ہوئیں، اطالیہ میں فاشطی تحریک کا ظہور بھی انہی وجوہات پر مبنی ہے۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی کا سبب کیا ہے؟ یہ وہی امر تنقیح طلب ہے۔ صدر کانگریس سے جب سوال کیا گیا کہ وہ اس عجیب وغریب نظام العمل کی تکمیل کب تک کر سکیں گے تو انہوں نے جواب دیا کہ ''میری زندگی کے اندر اندر'' اور اُس کے ساتھ کہا کہ جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو دستور کا خاتمہ کر دیں گے۔ مگر، نوکِ قلم سے نہیں!

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کب تک اس ''نوکِ قلم'' کو جوان کے ہاتھ میں ہے یونہی پکڑے رہیں گے؟ قہقہہ۔ ہندوستان میں ہماری تربیت برطانوی پارلیمانی جمہوریت کے روایات کے تحت ہوئی ہے۔

یہ دستور جو ہمارے سر تھوپا گیا ہے کم وبیش برطانوی طرز پر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس ملک اور انگلستان کی مملکت میں بنیادی تفاوت ہے، برطانیہ میں اکثریت کی جماعتیں تقسیم پذیر ہوتی ہیں اور اُن کا رنگ و روپ اور ان کی طاقت وقوت آئے دن بدلتی رہتی ہے۔

آج قدامت پرستوں کی حکومت ہے تو کل حریت پسندوں کی اور پرسوں مزدوروں کی لیکن ہندوستان میں یہ حال نہیں، یہاں ایک مستقل

ہندو اکثریت ہے اور باقی اقلیتیں ہیں جو کسی قابلِ قیاس مدت کے دوران میں اکثریت بن جانے کی توقع نہیں کرسکتیں۔ ہوسکتا ہے کہ اکثریت غیر فرقہ واری نقاب اوڑھ لے لیکن وہ اپنی سرشت اور اپنے افعال اور اعمال میں بلاشرکت غیرے ہندو ہی رہے گی۔ اقلیتوں کے لئے صرف یہی ایک امید ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی تنظیم کرلیں اور اپنے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لئے اختیارات کا ایک معین اور فیصلہ کن حصہ حاصل کرلیں، ایسے اختیارات کے بغیر کوئی دستور ہندوستان میں کامیابی سے نہیں چلایا جاسکتا۔ میں آپ سے یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ لیگ کے نظام میں شامل ہوجائیں، اگر مسلمانوں نے اتحاد واتفاق کرلیا تو آپ کی توقع اور اندازے سے کہیں پہلے سمجھوتا ہوجائے گا۔ لیکن حصولِ آزادی سے پہلے اپنے استحقاق کو منوانا ہوگا۔ چند ہی مہینوں کے کام سے لیگ کا نام ہندوستان کے ہر گوشے میں پہنچ گیا ہے۔ لاکھوں اشخاص اس میں شامل ہورہے ہیں، ایک دن وہ لوگ بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں محسوس کریں گے کہ وہ ایک سنگین مغالطے میں مبتلا ہیں اور اُن کے لئے صحیح طریقۂ کار یہی ہوسکتا ہے کہ وہ لیگ میں شریک ہوجائیں اور سارے مسلمانوں کی آواز ایک اور صرف ایک ہو، مجھے یقین ہے اور آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کانگریس کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ مسلمانوں میں افتراق پیدا کیا جائے۔ یہ برطانوی حکومت کی وہی پرانی چالیں ہیں۔ وہ (کانگریس) اپنے آقاؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں تم کہیں ان کی چالوں میں نہ آجانا! مسلمانوں کے لئے یہ موت وحیات کے لمحات ہیں مجھ سے یہ سن رکھو، اگر مسلمانوں میں باہمی اتحاد نہ ہوا تو وہ کسی قیمت پر بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے۔

آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟ اگر کل وردھا

کوئی فیصلہ کر کے حکم جاری کر دے تو لاکھوں ہندو اس کی تعمیل کرنے لگیں گے! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ فرض کرو مسلم لیگ کوئی حکم جاری کر دے تو کیا ہوگا؟ ہم کافی طور پر لیس اور تربیت یافتہ نہیں ہیں اسی وجہ سے تعمیل کے لئے لاکھوں مسلمان فراہم کرنا مشکل ہوگا۔ برطانوی حکومت یہ دیکھتی رہتی ہے کانگریس کیا کر رہی ہے اور برطانوی حکمتِ عملی کا کانگریس چھاؤنی میں کیا ردِ عمل ہونے والا ہے لیکن کیا حکومت تمہارے افعال و اعمال کی بھی پرواکرتی ہے؟ نہیں، کیونکہ تم ایک منظم قوت نہیں ہو۔ پس تم اپنی طاقت بڑھاؤ اور باہمی اتحاد کو استوار کرو۔ مسلم لیگ نے آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا ہے لیکن یہ آزادی نہ صرف مقتدر اور طاقت ور کے لئے ہوگی بلکہ کمزور اور مجبور کے لئے بھی ہوگی۔''

یہ تقریر قائداعظم نے 5/فروری 1938ء میں کی تھی لیکن ملک کے حالات کے پیشِ نظر ایسا محسوس ہوتا ہے یہ پیغام آج بھی ہم سے کہہ رہا ہے کہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ، تم دنیا کی نظر میں آج بھی معتبر نہیں ہو۔ صرف اس لئے کہ تم ایک منظم قوت نہیں بن سکے۔ قوموں کو طاقت ور قوت بننے کے لئے باہمی اتحاد ضروری ہے۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی آج 74/سال گزرنے کے بعد بھی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم قائداعظم کے پیغامات پر نہ صرف غور کریں بلکہ وقت کا شدید تقاضا یہ ہے کہ اُن پر عمل پیرا ہو کر ان ملک دشمن طاقتوں کی فتنہ پروریوں کا سدِ باب کر سکتے ہیں۔ قائداعظم نے جن حالات میں ملک حاصل کیا ان کی سب سے بڑی طاقت باہمی اتحاد تھا جس سے ہم آج بھی محروم ہیں۔ یہ محرومیاں ہمارا نصیب اس لئے بنتی جارہی ہیں کہ آج بھی ہمارے درمیان عنانِ حکومت سنبھالنے والے کچھ کج فہم ملکی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ مسائل سے ہارے ہوئے عوام سوالی ہیں کہ وہ آزادی کہاں ہے جو صرف مقتدر اور طاقت ور کے لئے نہیں ہوگی بلکہ کمزور اور مجبور کے لئے بھی ہوگی۔

بجلی، پانی، گیس، ریلوے، اسٹیل مل، پی آئی اے، یہ سب بحران اپنی جگہ، قتل غارت گری،

ایک طرف مجبوریوں نے زندگیاں قربان کرنے کے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، خودکشیاں اس کی مضبوط دلیل ہیں کہ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔

اتنے گمبھیر ماحول میں امید کی ایک کرن "عدلیہ" نظر آئی ہے۔ عدلیہ کے جرأت مندانہ فیصلے قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ قوم عدلیہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔

سیاسی جماعتوں کے اتحاد، نئی سیاسی جماعتوں کے وجود سے ملک کے مسائل حل ہوتے نظر نہیں آتے، مزدور کا درد مزدور ہی محسوس کر سکتا ہے۔ بڑے لوگ مسائل پر تقریر بہت اچھی کر لیتے ہیں، لیکن وہ مسائل کے کرب سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اُس دن کا انتظار ہے جب انصاف ہر دروازے تک پہنچے گا۔ تمام مسائل خود حل ہو جائیں گے۔

•••

مشاہیر کے مضامین

قائداعظم کی شخصی صفات

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل

برصغیر پاک و ہند میں قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت، ان کی ذہانت اور مستقل مزاجی ایک ایسے اعلیٰ مدبر کی علامت تھی جو اپنے جوہر دکھانے کے لیے مناسب وقت اور موقعہ کا انتظار کر رہی ہو۔ سید احمد خان کے بعد ملت کی تنظیم اور اس کے نصب العین کی تکمیل کے لیے قدرت نے قائداعظم کی شخصیت میں ایک ایسے رہنما کو منظرِ عام پر نمایاں کیا ہے جس کی استقامت اور ذہن کی بھرپور صلاحیتوں نے ملت کے اس خواب کو جسے اس کے اکابر ایک عرصے سے ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت کی صورت میں دیکھتے آئے تھے، عملی شکل دینے میں سب سے زیادہ مستعدی اور سرگرمی کا ثبوت دیا۔ 1906ء میں انھوں نے برعظیم کی سیاسی زندگی میں قدم رکھا۔ اس سال وہ پہلی مرتبہ منظر پر نمایاں ہوئے اور 1906ء سے 1947ء تک انھوں نے مستقل جدوجہد، دوراندیشی، جرأت مندی اور حق گوئی کی ایک مثال قائم کی۔ برعظیم کی سیاسی زندگی میں یہ عرصہ بڑے نشیب و فراز اور کشمکش و اضطراب کا ہے۔ مسلمانوں کے پیشِ نظر اس کی کئی صورتیں تھیں۔ وہ ایک طرف حکومت کی بے توجہی اور ظلم و زیادتی کا شکار تھے اور دوسری طرف ہندوؤں کی نفرت، کانگریس کی مخالفانہ تحریکوں اور مسلم کش فسادات کے نرغے میں تھے۔ قائداعظم کی اعلیٰ بصیرت اور ان کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیتوں نے منتشر اور مضطرب مسلمانوں کو، ان کے اس مقصد اور نصب العین کے تحت، جس کا خواب وہ ایک عرصے سے دیکھ رہے تھے، متحد اور منظم کرنے میں بالآخر کامیابی حاصل کی اور ملت کو اس منزل تک پہنچایا جو اس کے لیے ایک معینہ مقدر کی علامت تھی۔

ایسا بھی نہیں کہ قائد اعظم ہمیشہ ایک ہی راستے پر چلے ہوں۔ پہلے پہل وہ ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوس نہیں تھے۔ انھوں نے 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اس معاہدے کی تشکیل میں جو ''میثاقِ لکھنؤ'' کے نام سے مشہور ہے، ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ معاہدہ ان کی نیک نیتی پر مبنی تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے سے آزادی بہت جلد حاصل ہو سکے گی لیکن کانگریس نے اس معاہدے پر عمل نہ کیا اور اس موقع پر تو وہ مکمل آزادی کی خواہش مند بھی نہ تھی۔ قائد اعظم کانگریس کے اس طرح کے رویہ سے مایوس ہوئے اور جب ان کی مسلم دشمن تحریکیں شروع ہوئیں اور کانگریس نے ہمیشہ مسلمانوں کے قومی وجود اور ان کے مؤقف کو نظر انداز کیا تو قائد اعظم نے نہ صرف اس کی تحریکوں سے بیزاری کا اظہار کیا بلکہ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے زیادہ مستعد ہوئے۔ اس کا ایک اچھا اظہار ''نہرو رپورٹ'' کے جواب میں ان کے پیش کردہ ''چودہ نکات'' میں ہوا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کے مطالبات کے حق میں پیش کیے تھے۔ بعد میں پھر گول میز کانفرنس اور 1935ء کے قانون کی اصلاحات کے جواب میں ان کے دیے گئے بیانات برعظیم کے مسلمانوں کے مؤقف کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔

اب تک قائد اعظم کے سامنے حکومت اور ہندوؤں دونوں کی مسلم دشمنی کے تمام پہلو آ چکے تھے۔ اب ان کی تمام کوشش اس مقصد کے لیے تھی کہ برعظیم کی زندگی میں صرف دو قوتوں کا نہیں ایک تیسری قوت مسلمانوں کا بھی حق ہے۔ ان کی جدوجہد کا اب ایک ہی مقصد رہا کہ مسلمان چونکہ ہر اعتبار سے ایک علیحدہ قوم ہیں اس لیے انھیں ان کے مخصوص اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ملنا چاہیے۔ اس صورتِ حال میں ان کی جدوجہد ایک مقررہ منزل کے حصول کی جانب مستقل آگے بڑھتی رہی اور متعدد دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود پیچھے نہ ہٹی۔ انھوں نے حالات کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق مسلمانوں کو متحد کرنے اور مسلم لیگ کو منظم اور فعال بنانے اور اسے وسعت دینے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ اپنی قوم کے مزاج سے بھی واقف تھے اور مخالفوں کی نفسیات بھی خوب جانتے تھے۔ اس لیے سیاسی زندگی کے تمام مراحل و مقامات پر ان کو پوری گرفت حاصل رہی اور ان کا سیاسی ذہن بے حد منظم، مرتب اور مستحکم تھا۔ وہ ناسازگار حالات

میں بھی خود اعتمادی، بلند حوصلگی اور یقین محکم کے سبب نا قابلِ تسخیر رہے۔ان کا ایک بڑا کمال یہ بھی تھا کہ یہی اوصاف وہ اپنی قوم میں بھی پیدا کرتے رہے اور کسی حالت میں بھی قوم کو دل گرفتہ اور دل شکستہ نہ ہونے دیا۔ محض اپنی فراست، مستقل مزاجی اور بلند حوصلگی سے اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ایک عرصے تک مذاکراتی میزوں اور عملی سیاست کے میدان میں جنگیں لڑیں۔

پاکستان کا حصول محض ان شخصی صفات کی وجہ سے آسان ہو سکا جو قدرت نے قائداعظم میں پیدا کی تھیں اور قائداعظم نے ان کے ذریعے سے قوم کو متحد اور مستعد بنا کر اسے پاکستان کی منزل تک پہنچایا۔

◆◆◆

کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر بنانا چاہتے تھے؟

پروفیسر ہارون الرشید

ان دنوں پاکستانی میڈیا میں یہ بات بہت اُچھالی جارہی ہے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے، لہٰذا پاکستان کو ایک سیکولر اور لبرل ریاست ہونا چاہیے اور مذہب یعنی اسلام کو سیاست سے الگ کر دینا چاہیے۔

ان نام نہاد دانش وروں اور سیاست دانوں سے کوئی یہ پوچھے کہ انھوں نے تحریکِ پاکستان کی تاریخ پڑھی ہے؟ تحریکِ پاکستان کے دوران اور پاکستان کے قیام کے بعد قائداعظم کی تمام تقریروں کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا ہندوستان کے مسلمانوں نے لاکھوں جانوں کی قربانی اس لیے دی تھی کہ پاکستان میں سیکولر نظام قائم کیا جائے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران کیا مسلمانوں کا نعرہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ'' کا کوئی مطلب نہیں تھا؟ کیا پاکستانی ریاست کا نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' یونہی رکھ دیا گیا تھا؟ کیا ''قراردادِ مقاصد'' پاکستان کی پہلی قانون ساز اسمبلی نے منظور کر کے کوئی بڑی غلطی کی تھی؟

یہ لوگ بار بار قائداعظم کی ایک تقریر کا جو 11 راگست 1947ء کو نشر ہوئی تھی، حوالہ دیتے ہیں جس میں قائداعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان میں اقلیتوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ہندو اپنے مندروں میں اور عیسائی اپنے گرجوں میں جانے کے لیے آزاد ہوں گے۔ اس تقریر کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام اقلیتوں کو مذہبی آزادی نہیں دیتا؟ کیا اسلامی ریاست میں ہندوؤں اور دوسری اقلیتوں کو اپنی عبادت گاہوں میں جانے کی ممانعت ہوتی ہے؟

قائداعظم نے تو اسلام کی تعلیم اور احکامات کے مطابق یہ تقریر کی تھی جس کا الٹا مفہوم یہ نام نہاد دانش ور پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بھی واقف نہیں۔

پروفیسر خورشید احمد ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کے حالیہ شمارہ میں لکھتے ہیں:

> ''تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد کم از کم ڈیڑھ دو سو ایسے واضح بیانات تو صرف قائداعظم کے موجود ہیں جن میں اسلام کو اس جدوجہد کی منزل اور قرآن، اُسوۂ رسول، اسلامی قوانین اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بالادستی کے قیام کو پاکستان کا مشن اور ہدف قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری ڈھٹائی کے ساتھ ان کی دو ایک تقریروں کو سیاق وسباق سے کاٹ کر ان کے تصورات کی غلط تصویر پیش کرنے کی مذموم سعی کی جاتی ہے۔ یہ روش ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی ہے اور تمام حقائق کے سامنے آجانے کے باوجود ایک گروہ وہی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ اس سے خود اس گروہ کی بدنیتی بے نقاب ہوتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کا مقصد قائداعظم کے پورے تصور کو پیش کرنا نہیں بلکہ اپنے مقاصد کے لیے چند جملوں کو استعمال کرنا ہے۔ ایسی صریح بددیانتی پر اُٹھائی جانے والی دیوار ریت کی دیوار ہی ہوسکتی ہے جو کسی تعمیر میں کام نہیں آسکتی ہے۔''

کراچی میں 1943ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا:

> ''وہ کون سی چٹان ہے جس پر ملت کی عمارت قائم ہے اور وہ کون سا لنگر ہے جو سفینۂ ملّی کو تھامے ہوئے ہے؟ مسلم دنیا کے سفینۂ ملّی کا مستحکم لنگر عظیم المرتبت قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ویسے ویسے ہماری یہ وحدت بھی بڑھتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول، ایک قبلہ اور ایک قوم۔''

سرحد (خیبر پختونخواہ) مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کو جو پیغام قائد نے 1945ء میں دیا وہ یہ تھا:

''پاکستان کا مطلب صرف آزادی وحریت کا حصول نہیں ہے
بلکہ اسلامی نظریہ کا تحفظ بھی ہے جس کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ قیمتی تحفے
اور بیش بہا خزانے ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔''

اسی سال عید کے پیغام میں فرمایا:

''بجز ان لوگوں کے جو بے خبر ہیں ہر شخص آگاہ ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر و بالاتر اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ مذہبی بھی، معاشی ومعاشرتی بھی اور دیوانی اور فوجداری بھی، تجارتی بھی، عدالتی بھی اور تعزیری بھی۔ یہ ضابطہ زندگی کی ایک ایک چیز کو باقاعدگی اور ترتیب عطا کرتا ہے۔''

سبی دربار کے موقع پر 12رفروری 1948ء کو قائد نے عہد کیا:

''میرا ایمان ہے کہ ہم سب کی نجات ان سنہری قواعد اور ان زریں احکام کی پیروی میں مضمر ہے جو ہمارے رہن سہن اور معاملاتِ زندگی کو درست رکھنے کے لیے پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیے ہیں۔ آیئے ہم اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور تصورات پر اُستوار کریں۔

خدائے قادر مطلق نے ہمیں سکھایا ہے کہ مملکت کے تمام امور میں ہمارے فیصلے بحث وتمحیص اور مشاورت کی راہ نمائی میں ہوں۔''

(''ترجمان القرآن۔'' دسمبر 2015ء۔ اشارات۔ پروفیسر خورشید احمد)

ڈاکٹر صفدر محمود اپنے ایک حالیہ کالم ''قائداعظم کا تصورِ پاکستان'' میں لکھتے ہیں:

''قائداعظم کی تقاریر پڑھیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری فلاحی ملک بنانا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک اسلامی اور جمہوری اصولوں میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ قائداعظم نے

اپنی تقریروں میں کبھی بھی لفظ سیکولرزم استعمال نہیں کیا جب کہ اسلام ان کی تقریروں اور تحریروں کا محور نظر آتا ہے۔ 11 راگست 1947ء کی تقریر کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نفسِ مضمون اور مدّعا اقلیتوں کو احساسِ تحفظ اور بحیثیت شہری برابری کا پیغام دینا تھا اور قوم کو اتحاد کی تلقین کرنا تھا جس میں پاکستان کی بقا کا راز مضمر ہے۔''

''حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دانش وروں کا ایک طبقہ قائداعظم کی محض ایک تقریر کے چند فقروں کو اپنے سیاق وسباق سے الگ کر کے اپنا من پسند مفہوم نکال لیتا ہے اور قائداعظم کی اس سے قبل یا بعد میں کی گئی تقریروں کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ یہ بدنیتی نہیں تو اور کیا ہے؟ یوں تو قائداعظم کی تقریروں میں بہت سے حوالے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قائداعظم کے خیالات میں ایک تسلسل تھا اور وہ مسلسل پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام کا تصور پیش کرتے رہے۔ بلکہ اس نظام کا وعدہ کرتے رہے۔''

(روزنامہ ''جنگ'' کراچی، 25 دسمبر 2015ء)

◆◆◆

قائداعظم کے زرّیں اصول

ڈاکٹر جمال نقوی

قائداعظم محمد علی جناح کا تہ بہ تہ ذہن اگرچہ ان کے کردار کی طرح اقبال کے الفاظ میں پاک دلی اور پاکبازی کا آئینہ دار تھا، لیکن ان کے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ان کے سیاسی اہداف کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تاریخ پاکستان ہمیں بتاتی ہے کہ ۱۱، اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ یہ دستور ساز اسمبلی ان ممبران پر مشتمل تھی جو ان علاقوں سے منتخب ہوئے تھے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہوئے تھے۔ ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء کو قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خاں کو ملک کا پہلا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ جن اہم امور کی طرف قائداعظم نے فوری وخصوصی توجہ دی اور قوم کی رہنمائی کے لیے جو رہنما اصول بنائے تھے وہ یوں تھے:

- ☆ مہاجرین کی آبادکاری
- ☆ سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین
- ☆ صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین
- ☆ پاکستانی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین
- ☆ خارجہ حکمت عملی
- ☆ طلباء کو حصول علم کی طرف توجہ دلانا

مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلے میں ۳۰، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لاہور کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا کہ ''اب یہ ہم پاکستانیوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ

لاکھوں تباہ حال مہاجرین جو اپنا سب کچھ بھارت میں چھوڑ کر پاکستان آ رہے ہیں ان کی امداد کی جائے انھیں یہ مصیبتیں اس لیے سہنا پڑیں کہ وہ مسلمان ہیں۔"

قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے قائد ملت، ان کی کابینہ اور پاکستان کے عوام نے اس کارِ خیر میں بھرپور حصہ لیا اور مہاجرین کی آبادکاری کے کام کو انجام دیا۔ اس کے بعد اگر ملک کے تمام صوبوں میں یکساں ترقیاتی منصوبے بنائے جاتے اور عوام کے لیے روزگار فراہم کیا جاتا تو پاکستانی عوام اپنا گھر بار چھوڑ کر بڑے شہروں میں اور خصوصاً کراچی میں ہجرت نہیں کرنی پڑتی۔ ہمیں آج بھی قائداعظم کے مندرجہ بالا الفاظ یاد رکھنے چاہئیں اور ان آنے والوں کی امداد کرنی چاہیے جو کہ اپنے صوبوں، شہروں اور گوٹھوں سے کراچی آ رہے ہیں۔ ان آنے والوں کو بھی اس شہر کی ترقی خوشحالی اور امن کے لیے مل کر کام کرنا چاہیے۔ صوبائی اور علاقائی عصبیتوں اور مذہبی منافرتوں کو چھوڑ کر صرف پاکستان، مسلمان اور انسان کی بنیاد پر سوچنا اور عمل کرنا چاہیے۔

۲۵، مارچ ۱۹۴۸ء کو سرکاری افسران سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا تھا کہ "آپ کو قوم کے خادم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ آپ کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کوئی بھی جماعت برسراقتدار آ سکتی ہے، مگر آپ کا رویہ عوام کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے کہ ان کو احساس ہو کہ آپ حکمراں نہیں قوم کے خادم ہیں۔ آپ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اگر آپ میری نصیحت پر عمل پیرا ہوں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کا مقام اور مرتبہ بلند ہوگا۔

قائداعظم کے فرمان کا جملہ افسران اور اہل کاروں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انہوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے رات دن ایک کر کے ابتدائی بحران سے پاکستان کو نکالا۔ مگر افسوس ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہی ہم قائد کے فرمان کو بھول گئے۔ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی کو چھوڑ دیا اور قوم کے خادم ہونے کے بجائے اس کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ سرکاری افسران کا انتخاب چونکہ سیاسی بنیادوں پر ہونے لگا ہے اس لیے وہ اپنی جماعت کے تابع ہوتے ہیں، انھی کے مفاد کا سوچتے ہیں اور دوسروں کو اس سے محروم رکھتے ہیں۔ اس سے عوام کے درمیان بھی مغائرت بڑھتی جا رہی ہے اور ان میں اپنائیت کے جذبے کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ ہمیں اگر ملک میں اتحاد و یکجہتی کو

فروغ دینا ہے تو اپنی فکر میں تبدیلی لانی ہوگی۔

۱۵، جون ۱۹۴۸ء کی تقریر میں قائد اعظم نے کہا تھا کہ ''اب ہم پاکستانی ہیں، ہم میں سے کوئی بھی بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور بنگالی نہیں ہے۔ سب پاکستانی ہیں۔ ہماری سوچ اور ہمارا عمل پاکستانی کی حیثیت سے ہونا چاہیے اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے'' قائد نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ ان کو صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین کی اور قوم میں یکجہتی کی روح پھونکی۔

قائد اعظم کی آنکھ بند ہوتے ہی ہم یکجہتی کے اس پیغام کو بھلا کر طبقاتیت، صوبائیت، اور نسلی امتیازات کو فروغ دینے لگے۔ ایک دوسرے کے حقوق غصب کرنے لگے یہاں تک کہ ہماری ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے پاکستان کا ایک بازو علیحدہ ہوگیا لیکن ہم نے اپنی اس غلطی سے سبق حاصل نہیں کیا اور آج بھی عوام کو ان کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مٹھی بھر صاحب اقتدار فاسد، ناقص اور بدچلن سیاست دانوں نے عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے جس کی وجہ سے ہم ۶۵ سال بعد بھی ترقی کے ان منازل کو طے نہیں کر سکے جن کو ہمارے ساتھ اور ہمارے بعد آزاد ہونے والی مملکتوں نے اپنی نیک نیتی، قومی جذبے اور مسلسل جدوجہد سے اب تک حاصل کرلیا ہے۔ کاش کہ ہم ابھی بھی سنبھل جائیں۔

یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر قائد اعظم نے پاکستان کی معیشت اور اقتصادیات کے رہنما اصولوں کا تعین کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''مغربی معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاتعداد ناقابل حل مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ مغربی طرز کا معاشی نظام ہمارے ملک میں خوشحالی اور ترقی نہیں پیدا کرسکتا، اس لیے ہمیں اپنی بہبود کے لیے کوئی نیا طریقہ وضع کرنا ہوگا اور دنیا کو ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہوگا جس کی بنیادیں مساوات اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہوں۔ ایسا کرنے سے ہم مسلمان قوم کی حیثیت سے دنیا کو ایک ایسا معاشی نظام دینے میں کامیاب ہو جائیں گے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے امن کا پیغام بن کر آئے گا۔ یاد رہے کہ امن ہی سے انسانیت کی بقا اور خوشحالی قائم رہ سکتی ہے۔

مگر ہم قائد کی خواہش کے مطابق فلاح و آشتی اور امن و انصاف کا نیا معاشی نظام دنیا کو کیا

دیتے خود اپنے ہی ملک کو نہ دے سکے۔ بات یہ نہیں کہ ہمارے پاس ایسے ماہرین نہیں ہیں، وجہ یہ ہے کہ ہمارے صاحب اقتدار و اختیار ایسے ماہرین کو موقع نہیں دیتے اور اگر وہ اپنی محنت سے کوئی ایسا طریقہ ایجاد بھی کر لیتے ہیں تو وہ چونکہ ہمارے اپنے مفاد میں نہیں ہوتا لہٰذا ہم اسے چلنے نہیں دیتے کیونکہ ہمیں ملک کے مفاد سے تو کوئی غرض ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اعلیٰ ترین دماغوں کو دوسروں نے خرید لیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہم تو اتنے بدقسمت ہیں کہ ہمارے ایک سائنسداں نے نوبل انعام حاصل کیا تو اس کو بھی ہم مذہبی بنیادوں پر اپنانے کو تیار نہیں ہوئے اور اس کی ایجادات سے غیر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دوسرے سائنسداں نے ہمیں ایٹمی قوت عطا کی اسے ہم نے قید تنہائی عطا کی۔ ہمارے ماہرین معاشیات ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف میں رہ کر دوسروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ یہ ایک لمبی داستاں ہے کہاں تک سنو گے کہاں تک سنائیں۔

قائداعظم کی خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تمام ممالک سے بالعموم اور ہمسایہ ممالک سے بالخصوص برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔ پاکستان اقوام متحدہ کا رکن بن گیا اور بہت سے ممالک کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم ہو گئے مگر پاکستان کو اپنے وجود میں آنے کے بعد ہی سب سے زیادہ بھارت کے منفی رویوں سے نقصان پہنچتا رہا۔ جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مگر ہم دوسروں کو کیا کہیں شاید ہمارے پاس ہی محب وطن اور زیرک سیاستدانوں کی کمی ہے۔ ان ۶۵ سالوں میں کئی بار ہمارے تعلقات کی بہتری میں پیش رفت بھی ہوئی مگر کامیابی ہمارا مقدر نہ بن سکی۔ مسلمان ملکوں کے ساتھ تو ہمارے تعلقات قدرے بہتر رہے۔ اور کبھی کبھی تو ہم نے ان کی قیادت بھی کی ہے۔ کاش ہمارے سیاسی لیڈروں میں وہ شعور پیدا ہو جائے جس کی خواہش قائد اعظم رکھتے تھے اور جس کا نمونہ وہ خود تھے۔ اسی لیے ''ورڈ کٹ آف انڈیا'' کے مصنف بیورلی نکلس نے انھیں ایشیاء کا اہم شخص قرار دیا اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے جو ۱۹۴۸ء میں مغربی بنگال کے گورنر تھے انھوں نے قائداعظم کے بارے میں کہا ''وہ اس صدی کے سب سے ممتاز فرد تھے۔ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔''

پشاور میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی تمام تر توجہ حصول علم پر مرکوز کریں۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں طلباء نے جو اہم کردار ادا کیا تھا قائداعظم

نے اس کی تائید کی مگر فرمایا کہ طلباء کو اب احتجاجی سیاست سے کلیتاً گریز کرنا ہوگا۔ اسی میں پاکستان کی بقا اور خوشحالی ہے۔

ہم نے قائداعظم کی اس نصیحت کو بھی نظر انداز کر دیا اور اب تمام سیاسی پارٹیاں اپنے مقاصد اور اپنے مفاد کی خاطر طلباء کو استعمال کرتی ہیں لیکن ان کی بھلائی اور تربیت کے لیے قائم طلباء یونین، بزم طلباء اور اسی قسم کے دیگر پروگراموں پر کوئی توجہ نہیں دیتیں۔ حکومتوں نے بھی نئی یونیورسٹیاں تو قائم کر دی ہیں، مگر تعلیم پر مختص کیے جانے والے بجٹ میں کٹوتی ہوتی رہتی ہے۔ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور نہ ہی کیریئر پلاننگ کی جا رہی ہے۔

اگر ہمیں اپنے ملک کے لیے روشن راہوں کی تلاش ہے تو ہمیں نیک نیتی کے ساتھ قائد کے ان زرّیں اصولوں پر عمل پیرا ہونا چاہیے:

"کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی"

(کمال حاصل کرو تا کہ جیتے جی دنیا میں عزت حاصل ہو)

(۱۹، دسمبر ۲۰۱۲ء)

◆◆◆

قائداعظم کا تصورِ ریاست

شاعر علی شاعر

اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ قائداعظم محمد علی جناح کے افکارِ جدید نے انھیں دیگر سیاسی راہ نماؤں اور صاحبِ اقتدار افراد سے منفرد و ممتاز کر دیا تھا۔ قائداعظم نے اپنے علوم وافکار کی بنا پر اپنے فطین ذہن سے ایسی مشکلات کا حل تلاش کیا جن تک اس زمانے کے عالم وفاضل اور سیاسی بصارت وبصیرت رکھنے والوں کی رسائی تک نہیں تھی۔ دراصل قائداعظم زبانی جمع خرچ کے قائل نہیں تھے، وہ عملی سیاست کے علم بردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قانون اور آئین کی بالادستی کے لیے عملاً کام کیا جس کے لیے اُنھوں نے اپنی زندگی اور تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ وہ شروع ہی سے اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں اور اُن کے حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کی قربانیوں اور ایثار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قائداعظم نے اپنے علم، قلم، ذہن، قابلیت، صلاحیت اور تمام تر روحانی وجسمانی طاقتوں سے عوام کے حقوق کی جنگ لڑی اور وہ اس میں سرخ رو ہو کر فتح یاب ہوئے۔ یہ قائداعظم ہی کی قربانیوں کا ثمرہ ہے کہ ہم آج ایک علاحدہ ریاست میں آزادانہ سانس لے رہے ہیں اور سکون سے زندگی گزار رہے ہیں۔ قائداعظم نے اپنے آخری سانس تک پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے جو فعال کردار ادا کیا اُسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص قائداعظم کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو وہ محسن کش انسان اور احسان فراموش ہوگا۔ قائداعظم پاکستان سے اِس قدر مخلص و وفادار تھے کہ انھیں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے صرف ایک سال کی مدت نصیب ہوئی، اس ایک سال میں بھی اُنھوں نے پاکستان کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوششیں کیں اور پاکستان کی تشکیل اور تکمیل کے لیے بھرپور کردار ادا کرتے رہے۔ نئے اداروں کی بنیاد رکھنا، نئے مراکز تشکیل دینا، مالی وسائل کی کمی کو اپنی ذہانت

سے پورا کرنا، مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور درپیش مسائل کو حل کرنا، یہ سب قائداعظم کی ہمت، ذہانت، سیاسی بصیرت اور دور اندیش طبیعت کے تحت ہی ممکن ہو سکا۔

قائداعظم محمد علی جناح پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو زیادہ تر انگریزی اور کم کتابیں اُردو زبان میں ہیں مگر انگریزی زبان میں لکھی گئی کتابوں کا اُردو ترجمہ ہونے سے مشکل آسان ہو گئی ہے۔ ان تمام کتابوں کے مطالعے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ بانیِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے جس طرح کا پاکستان بنانا چاہا تھا یا بنایا تھا، یہ پاکستان ویسا نہیں ہے۔ موجودہ پاکستان نہ تو علامہ اقبال کا خواب ہے اور نہ قائداعظم کی عملی سیاست کا نقشہ، اگر پاکستان کو قائداعظم کے افکار کی روشنی میں تشکیل دیا جاتا ہے تو اس وقت پاکستان خوش حالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا اور ہمارے بعدِ آزاد ہونے والے ہندوستان سے دوگنی ترقی کر جاتا۔ دراصل ہمیں صرف قائداعظم کی تقریروں کے اقتباسات پڑھائے جاتے رہے ہیں مگر بہ حیثیت گورنر جنرل قائداعظم نے پاکستان کی تشکیل کے لیے جو اقدامات کیے، فیصلے صادر فرمائے، پالیسیاں بنائیں، ہدایات جاری کریں، فائلوں پر اہم اور تاریخی نوٹ لکھے، نئے ضوابط واضح کیے، احکامات جاری کیے اور آئندہ کا لائحۂ عمل اختیار کیا۔ وہ سب تحریریں اور ثبوت کہاں ہیں؟ پاکستان کی نئی نسل کو اِن سب چیزوں اور معلومات وآگہی سے لاعلم کیوں رکھا گیا۔ اگر قائداعظم کی مذکورہ بالا تمام تحریروں کی روشنی میں پاکستان کو چلایا جاتا تو آج پاکستان وہی پاکستان ہوتا جو علامہ اقبال کا خواب تھا اور قائداعظم کی عملی سیاست کی تصویر۔ قائداعظم کے نظریات اتنے جان دار، وسیع اور ان کے خیالات وتصورات اس قدر مضبوط تھے کہ حلیف تو حلیف، حریف بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قائداعظم انسانی حقوق کے لیے ایک اسلامی فلاحی مملکت قائم کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم کے ذہن میں مذہبی جماعتوں کی حکومت کا کوئی تصور تھا نہ قیادت کا۔ پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم نے اپنے قریبی ساتھی علامہ شبیر احمد عثمانی کو کسی منصب پر فائز نہیں کیا۔

تحریکِ پاکستان کے عظیم راہ نما قائداعظم محمد علی جناح کی نظر میں اس ریاست کی بنیاد جمہوریت تھی۔ لہٰذا انھوں نے جمہوریت کی بقا کے لیے فیصلے صادر فرمائے اور پاکستان کا آئین بنانے کے لیے دستور ساز اسمبلی کو اختیار دیا کہ وہ ایسا آئین بنائے جس میں مسلمانوں کے ملک

میں غیر مسلم کو بھی رہنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ ان کی عبادت گاہوں کے قیام پر پابندی نہ ہو۔ قائداعظم کی یہ سوچ سو فی صد اسلامی سوچ تھی کیوں کہ دینِ اسلام نے بھی غیر مسلم کے حقوق کی بات کی ہے۔ حضورِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ قانونی تقاضے پورے کرنے کے احکامات صادر فرمائے ہیں۔ لہٰذا قائداعظم کا پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو امن و امان کا گہوارہ ہو، جس میں انسانی جان کی وقعت ہو، انسان کے حقوق کا خیال رکھا جائے، غیر مسلموں کو مذہبی آزادی حاصل ہو، قائداعظم کا تصورِ ریاست صرف اور صرف جمہوری تھا کیوں کہ قائداعظم جمہوریت پر یقین رکھتے تھے اور انھیں کسی قوم و ملت اور ملک کی سالمیت جمہوریت ہی میں نظر آتی تھی۔ لہٰذا اُنھوں نے ہمیشہ مسلم قوم کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے جمہوریت کو فوقیت دی۔ اسی تصور کو مرکز و محور جان کر پاکستان حاصل کیا گیا اور ایک جمہوری ریاست معرضِ وجود میں لائی گئی۔ آج پاکستانی عوام، حکومت اور صاحبِ اقتدار لوگ جن نامساعد حالات سے دوچار ہیں اور جن مشکلات کا رونا رو رہے ہیں ان کی وجوہات قائداعظم کے تصورات سے انحراف ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کو استحکام نصیب ہو، خوش حالی کا دور دورہ ہو، پاکستان ترقی کی راہ پر گامزن ہو، بیرونی خلفشار سے دوچار نہ ہو، بیرونی طاقتوں کے زیرِ اثر نہ رہے اور خود مختار حیثیت سے قائم رہے تو ہمیں تصوراتِ قائداعظم کو اپنانا ہوگا، ان پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ ان کو عملی زندگی میں رائج کرنا ہوگا۔ ان افراد کی بیخ کنی کرنا ہوگی جو تصوراتِ پاکستان اور افکارِ قائداعظم کے مخالف ہیں۔ ایسے افراد کو نہ صرف اقتدار سے ہٹانا ہوگا بلکہ انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانا ہوگا اور ایسے افراد کو صاحبِ اختیار اور صاحبِ اقتدار بنانا ہوگا جو افکارِ قائداعظم سے متفق ہیں اور حامیانِ قائداعظم میں اُن کا شمار ہوتا ہے، تبھی پاکستان کو ایک اسلامی اور فلاحی ریاست بنایا جاسکتا ہے۔ دشمنانِ پاکستان اور دشمنانِ اسلام سے پاکستان اور مسلمانوں کو بچایا جاسکتا ہے۔ جہاں اسلام ہوگا وہاں جمہوریت ہوگی، جہاں جمہوریت ہوگی وہاں انسانی حقوق کی ادائیگی ہوگی۔ جب انسانوں کو ان کے حقوق ملیں گے تو انسان خوش حال ہوگا۔ جب وہ خوش حال ہوگا تو امن پسند زندگی گزارے گا۔

قائداعظم کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُنھوں نے ہمیشہ پاکستان کے لیے اسلامی ریاست کے الفاظ ادا نہیں کیے بلکہ مسلم ریاست کے نام سے پکارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر پاک

و ہند کی مذہبی جماعتیں اُن کے خلاف ہو گئیں جن میں خاکسار تحریک، جماعت اسلامی، مجلسِ احرار اور جمعیت العلمائے ہند شامل ہیں۔ ان جماعتوں نے مسلم ریاست کا لفظ سن کر سوچ لیا کہ قائداعظم پاکستان کو مذہبی ریاست بنانے کے حق میں نہیں ہے مگر اُنھوں نے اتنا خیال نہیں کیا کہ جو مملکت مسلم ہوگی کیا وہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں ہوں گے؟ ان مذہبی جماعتوں نے قائداعظم کے ان خطبات کو بھی پسِ شت ڈال دیا جن میں قائداعظم نے واضح طور پر اسلام، قرآن اور قرآن و حدیث کی بات کی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ پاکستان ایک مسلم ریاست ہوگا جس مین مسلمان اکثریت میں ہوں گے، لہٰذا پاکستان کا قانون اور آئین قرآن وسنت کی روشنی میں ترتیب دیا جائے گا۔ دراصل مذہبی جماعتوں کی مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ قائداعظم کے ذہن میں اسلام کا جو تصور تھا وہ کٹر مذہبی راہ نماؤں سے مختلف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قائداعظم نے اپنے خطبات میں عبادات پر کم اور معاملات پر زیادہ زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلام کے بنیادی اصول قائم ہوں جن کی روشنی میں مساوات کا دور دورہ ہو، کسی کے ساتھ غیر مساویانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے۔ سب کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔ اُخوت قائم ہو، بھائی چارے کی فضا میں زندگی گزاری جائے۔ باہمی تعاون ایک دوسرے کو حاصل ہو۔ عدل وانصاف ہو، ہر ایک کو انصاف فراہم کیا جائے، یہ نہ ہو کہ کسی بااثر شخصیت کے جرم کو معاف کر دیا جائے اور عام اور غریب انسان کو سزا سنادی جائے۔ اس لیے قائداعظم نے بار بار یقین، تنظیم اور ایثار پر زور دیا۔ قائداعظم ہر لحظہ اسلامی ریاست کے قیام کے حامی رہے ہیں۔ قائداعظم چاہتے تھے کہ پاکستان میں وہی اسلامی معاشرہ قائم ہو جس کا نمونہ حضورِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ طیبہ میں پیش کیا تھا۔ وہ پاکستان کو معاشرتی، سماجی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی حوالے سے اسلام کا قلعہ بنانا چاہتے تھے۔ جمہوری اور فلاحی ریاست ان کا خواب تھا جس میں رہنے والے تمام انسان بلاتفریق رنگ و نسل اور مذہب وعقیدہ مساوی حقوق حاصل کرسکیں۔ وہ پاکستان کو تمام شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں لانا چاہتے تھے جس میں شیعہ، سنی، وہابی، دیوبندی، اہلِ حدیث، ہندو، عیسائی، پارسی اور قادیانیت سے تعلق رکھنے والے افراد کو مذہبی آزادی حاصل ہو، کسی پر عرصۂ حیات تنگ نہ کرنا اور اُس کو اُس کی عبادات سے منع نہ کرنا، قائداعظم کے ذہن میں پیوست تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں ہر مذہب، ہر رنگ و نسل اور ہر عقیدے کا شخص آسودہ حالی، آزادی اور بے خوف

و خطر زندگی گزارے۔ یہی اسلام کے بنیادی اصول ہیں جن پر قائداعظم نے خود بھی عمل کیا اور وہ پاکستان میں بھی ان سنہری اصولوں کا نفاذ چاہتے تھے۔ یہ وہ سنہری اُصول تھے جن کا اطلاق پوری انسانیت پر ہوتا ہے۔

قائدِاعظم نے اپنے خطبات میں یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ پاکستان کے نظام کی بنیاد اسلامی اصولوں پر قائم ہوگی اور پاکستان کے نظام، آئین اور ملکی ڈھانچے کو اسلامی اصولوں پر اُستوار کیا جائے گا۔ ان کی زبان سے ہمیشہ یہی نکلتا رہا ہے کہ قرآن ہمارا راہ نما ہے اور ہمیں قران کی روشنی میں زندگی بسر کرنا چاہیے۔ ہاں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ قائداعظم مُلائیت کے خلاف تھے۔ مذہبی فرقہ واریت کے حامی نہیں تھے۔ وہ مذہبی تشدد کے مخالف تھے۔ ظاہر ہے جن باتوں کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے ان باتوں کو پاکستان کا آئین کیسے بنایا جاسکتا تھا۔ مذہبی منافرت، فرقہ واریت، مذہبی تشدد اور مُلائیت اس پاکستان کا حصہ نہیں ہوسکتے جو پاکستان قائداعظم نے بنانا چاہا تھا۔ آج پاکستان ان تمام اصولوں، ضوابط اور بنیادوں سے ہٹ چکا ہے جو قائداعظم کے ذہن میں تھیں۔ جس پاکستان کا تصور قائداعظم نے پیش کیا تھا یہ اُس کے برعکس نظر آ رہا ہے۔ آج فرقہ واریت، تشدد پسندی، لسانی تعصبات، رنگ و نسل کی تفریق، ذات پات کا فرق اور چھوٹے بڑے کا جھگڑا عام ہے۔ یہاں چند خاندانوں کی حکومت قائم ہے جسے ہم بادشاہت یا آمریت تو کہہ سکتے ہیں جمہوریت نہیں اور جس ملک میں جمہوریت نہ ہو، وہ قائداعظم کا پاکستان نہیں ہوسکتا۔

قائداعظم کی مخالفت پر وہ افراد بھی کمربستہ ہوگئے تھے جو سرمایہ دار اور جاگیردار تھے کیوں کہ قائداعظم کی سیاسی بصیرت عوام کے لیے کام کر رہی تھی اور وہ ایسا پاکستان چاہتے تھے جہاں عوام کی حکومت ہو، عوام کی فلاح و بہبود کا کام ہو، اور عوام کو مرکزیت اور اہمیت حاصل ہو۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لیے یہ بات تنزل کے مترادف تھی، لہٰذا انھوں نے خود کو پستی میں گرتے دیکھا تو قائداعظم کے مخالف ہوگئے۔ مُلائیت، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے متوالوں نے قائداعظم کے احکامات کو رد کرکے، ان کے فیصلوں کو صادر نہ ہونے دیا۔ قائداعظم کی تحریریں اور فیصلہ جات کی مسلیں غائب کرنا شروع کردیں۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ قائداعظم کی کچھ تحریریں ترامیم کے بعد منظرِ عام پر لانے لگے۔ جس کا اثر آج پاکستان میں نظر آ رہا ہے کہ مذہبی تشدد پسندی نے زور پکڑ رکھا ہے۔ فرقہ واریت عام ہے، نسلی تضادات اور لسانی تعصبات کا

بول بالا ہے، مہنگائی کنٹرول میں نہیں ہے، عبادت گاہوں پر حملہ آئے روز کا معمول بن گئے ہیں۔ انسانی جانوں کی ارزانی کسی آنکھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ شہروں میں جنگل کا قانون رائج ہے، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا قانون نافذ ہے۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی اجارہ داری قائم ہے۔ باپ کے ساتھ اس کی اولاد، اہلیہ، داماد اور تمام رشتے داروں میں حکومتی عہدوں کی بندر بانٹ ہو رہی ہے۔ سرمایہ چند خاندانوں کی میراث ہو کر رہ گیا ہے۔ حکومت پر دو تین پارٹیوں کا اجارہ قائم ہو گیا ہے۔ بادشاہت کا نظام چل رہا ہے۔ یہ آمریت غیر رسمی ہے، اسے ہم کسی طور پر جمہوریت نہیں کہہ سکتے۔

اگر قائداعظم کے قوانین، اصول اور افکار کی روشنی میں پاکستان کو چلایا جاتا تو ان کے نظام کو نافذ کیا جاتا، ان کے فیصلوں کو مانا جاتا، ان کے احکامات پر عمل درآمد ہوتا، پاکستان کو مسلم ریاست بنایا جاتا، اسے مُلائیت، مذہبی شدت پسندی اور غیر مساویانہ رویوں سے بچایا جاتا، حکومت کی بھاگ دوڑ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، امیروں، کبیروں، وڈیروں اور چودھریوں کو دینے کی بجائے قائداعظم کے ساتھیوں، ملک و قوم کے وفاداروں، افکارِ قائداعظم کے ماننے والوں اور محب الوطن، اسلامی شعار کے جانشینوں کو دی جاتی تو آج پاکستان کی ترقی کا عالم قابلِ مثال ہوتا اور دنیا میں پاکستان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا اور پاکستانی قوم کا وقار قائم رہتا۔ آج مسلمانوں کو دہشت گرد کہہ کر پکارا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کو تیسرے درجے کی مخلوق سمجھا جا رہا ہے۔ یہ سب قائداعظم کے مشن سے انحراف کا سبب ہے۔ قائداعظم کے نظریات کے برعکس ہونے کا سبب ہے۔ قائداعظم کے تصورات کو پسِ پشت ڈالنے کا سبب ہے۔ قائداعظم نے اپنے خطبے میں افسران اور صاحبِ اقتدار لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ باتیں باور کرائیں کہ آپ حکمران نہیں بلکہ عوام کے خادم ہیں۔ آپ کو عوام پر حکومت نہیں کرنی بلکہ ان کی خدمت کرنی ہے۔ آپ خود کو حکمران طبقے میں شمار نہ کریں بلکہ خدمت گاروں میں آپ کا شمار ہونا چاہیے۔ آپ ان کے آقا بن کر ان سے غلاموں والا سلوک نہ کریں بلکہ ان کے دوست، مددگار اور خیر خواہ بن جائیں اور ان سے ہم دردی، لحاظ و مروّت اور نرم روی سے پیش آئیں۔ ان کے معاملات میں عدل و انصاف سے کام لے کر مساوی رویہ اختیار کریں۔ قائداعظم کا مقصد پاکستان میں قانون کی بالادستی کا قیام تھا مگر یہاں اسی قدر لاقانونیت کا بول بولا ہے، جس

قدر قائداعظم نے اس کی بیخ کنی کرنا چاہی۔

جس طرح اسلام کی نظر میں انسان کو دنیا کی تمام مخلوقات پر افضیلت حاصل ہے اسی طرح قائداعظم کی نظر میں بھی انسان کا رتبہ تمام اشیا اور مخلوقات سے اعلیٰ تھا۔ انھوں نے تمام عمر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا اور انسانیت کی فلاح کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ کوئی شخص اپنی طاقت سے زیادہ کام نہیں کر سکتا مگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قائداعظم نے اپنی طاقت سے زیادہ کام کیا۔ اپنی عمر سے زیادہ زندگی گزاری۔ وہ انسان، مسلمان اور پاکستان سے اس قدر وفادار اور ان پر جاں نثار تھے کہ ایک بار ان کی اس جاں نثاری، قربانی اور ایثار کو دیکھ کر ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے کہا۔

"آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں اور کام کے اوقات کم کر دیں۔"

قائداعظم نے جواب دیا:

"کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ فوج میدانِ جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو اور اس کے جرنیل نے چھٹی لے لی ہو۔"

فاطمہ جناح نے مزید کہا:

"آپ کی زندگی بڑی قیمتی ہے۔"

قائداعظم نے جواب دیا۔

"جب میں دس کروڑ افراد کی بقا کے لیے تشویش میں مبتلا ہوں تو ایک فرد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے۔"

یہ وہ عظیم ہستی ہیں جن کو آج ہم قائداعظم محمد علی جناح کے نام سے یاد کرتے ہیں جن کے ایثار و جاں نثاری کے سبب ہم آزاد ملک پاکستان میں سکون کا سانس لے رہے ہیں اور آزادی سے جی رہے ہیں۔ ہمیں مل کر سوچنا ہے کہ پاکستان کو قائداعظم کا پاکستان کس طرح بنایا ہے۔ اس میں ہماری عزت، نیک نامی، وقار اور بقا شامل ہے۔ قائداعظم کے تصورِ ریاست کے سانچے میں پاکستان کو ڈھالنے سے ہی استحکامِ پاکستان کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ ہمیں افکارِ قائداعظم ہی پر عمل سے ترقی کی راہیں مل سکتی ہیں اور ہمارا معیارِ زندگی بلند ہو سکتا ہے اور ہمارا کھویا ہوا وقار بحال ہو سکتا ہے۔

◆◆◆

قائداعظم محمد علی جناح کا سیاسی سفر

حمیدہ کشش

قائداعظم محمد علی جناح کا مسلم لیگ بنانے یا برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت کرنے اور ایک علاحدہ ملک بنانے کا ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ تو لندن گئے تھے قانون کی ڈگری حاصل کرنے اور واپسی پر ان کا خیال تھا کہ ایک بہترین وکیل بن کر کامیاب زندگی بسر کروں گا۔ انہوں نے اپنے مستقبل کے بارے میں یہی سوچا تھا۔ وہ بڑی محنت سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے میں مگن و مصروف تھے۔ انہوں نے لنکن اِن میں قانون کا امتحان دو سال میں پاس کرلیا اور ساتھ ہی یہ ریکارڈ بھی قائم کیا کہ اٹھارہ برس کی عمر میں بیرسٹر کہلانے والے وہ سب سے کم عمر ہندوستانی تھے لنکن اِن میں تعلیمی رسومات پوری کرنے کے بعد محمد علی جناح نے 11 رمئی ۱۸۹۶ء کو سندھ حاصل کرنے کی درخواست دے کر اپنی بقایا رقم نیشنل بینک آف انڈیا بمبئی میں منتقل کردی تھی۔

اس کم عمری میں محمد علی جناح کا تنہا لندن میں قیام اور وہاں کے ماحول سے خود کو بچانا بھی نیک بختی تھی۔ لہٰذا انہوں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے برٹش میوزیم لائبریری کا رخ کیا۔ جہاں ہر اسکالر کو جانے کی تمنا و خواہش بے چین رکھتی ہے۔ محمد علی جناح نے لائبریری کے لیے ایک ریڈر کی حیثیت سے ممبر شپ حاصل کی۔ کبھی کبھی وہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں بھی جایا کرتے تھے۔ وہ لبرل پارٹی کے رہنماؤں کی تقریریں سنتے اور ان سے بے حد متاثر ہوتے۔ محمد علی جناح کی ان سب حالات پر نظر تھی اور وہ اپنی تعلیم پر بھی مکمل توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے۔ دادا بھائی نوروجی لندن میں مقیم تھے جو ہندوستان سے تشریف لائے تھے اور ایک سیاسی پارسی بزرگ تھے۔ ان کی ہندوستان اور لندن میں بڑی شہرت تھی۔ ان کی مقبولیت کی بنا پر لبرل پارٹی نے ان کو انتخاب کے

لیے ٹکٹ دے دیا تھا۔ اس پر سالبری برطانوی وزیرِ اعظم نے دادا بھائی نوروجی کو کالا آدم کہہ دیا جو سراسر رنگ و نسل کے تعصب پر مبنی تھا حالاں کہ دادا بھائی نوروجی کا رنگ کالا نہ تھا مگر فرنگی اپنے علاوہ سبھی کو کالی نسل سمجھتے تھے۔ برطانوی وزیرِ اعظم کے اس متعصب بیان نے ہندوستانی طلبا اور عام ہندوستانی انسانوں میں سخت اشتعال پھیلا دیا اور انگلستان کے پڑھے لکھے اور سنجیدہ لوگوں نے بھی اپنے وزیرِ اعظم کے اس حقیر بیان کو پسند نہیں کیا اور انہوں نے برطانوی وزیرِ اعظم سے ناراضگی کا اظہار کیا۔

دادا بھائی نوروجی نے اس کا جواب دینے کے لیے پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ لندن میں مقیم ہندوستانی طلبا اور عام ہندوستانی افراد نے ان کی مدد کے لیے خود کو دتیار کر لیا تھا۔

مشہور ہے کہ یہیں سے محمد علی جناح کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ انگریز ہندوستان والوں کو اس قدر نفرت کے قابل سمجھتے ہیں اور ہندوستانیوں پر بے حد ظلم و ستم کے واقعات تو محمد علی جناح کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ پس وہ لندن سے واپس آئے اور 24/اگست 1896ء کو انہوں نے اپنا نام بہ حیثیت بیرسٹر بمبئی ہائی کورٹ میں درج کرا لیا۔ 1900ء میں محمد علی جناح کو بمبئی کے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر میکفرسن کے چیمبر میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ مسٹر میکفرسن جو ایک سنجیدہ، بیدار مغز اور نسلی تعصّبات سے مبرا سوچ رکھنے والے شخص تھے، انہوں نے محمد علی جناح کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کے لیے اپنی ذاتی اور نایاب لائبریری کے دروازے کھول دیئے۔ اس طرح محمد علی جناح کو مزید آئین و قانون کے ذخیرے کا مطالعہ کرنے کا بھرپور موقع ملا جس سے انہوں نے اپنی زندگی اور قانونی میدان میں مکمل استفادہ کیا اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر آئندہ کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہم کنار ہوئے۔

محمد علی جناح کی زندگی میں دو اشخاص نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ایک مسٹر کرافٹ تھے جنہوں نے محمد علی جناح کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا تھا اور محمد علی جناح ان کے مشورے اور تحریک ہی پر لندن گئے تھے اور لنکن اِن میں داخلہ لیا تھا۔ دوسرے شخص مسٹر میکفرسن تھے جنہوں نے محمد علی جناح کو قانون کے میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے تھے۔ اس طرح محمد علی جناح مسٹر میکفرسن کے ماتحت ہو کر کام کرنے لگے۔ کچھ عرصے بعد مجسٹریٹ کی ایک آسامی خالی

ہوئی تو مسٹر میکفرسن نے ایک خط لکھ کر محمد علی کو دیا جو انہوں نے صوبائی قانونی مشیر سر چارلس کو دیا اور مجسٹریٹ کی اسامی پر اپنی تقرری کی درخواست کی۔ سر چارلس نے مسٹر میکفرسن کا خط پڑھا جس میں انہوں نے محمد علی جناح کی قابلیت اور خداداد صلاحیت کا تذکرہ کیا تھا اور آپ کے اخلاق و کردار کی تعریف لکھی تھی۔ مسٹر سر چارلس صوبائی قانونی مشیر نے آپ کو تین ماہ کے لیے مجسٹریٹ کی آسامی پر رکھ لیا، کیوں کہ یہ آسامی مجسٹریٹ کے چھٹیوں پر جانے کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔ محمد علی جناح کو پریذیڈنسی مجسٹریٹ کا عہدہ دیا گیا۔ محمد علی کو اپنی قابلیت دکھانے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ آپ نے عرق ریزی، باریک بینی، تندہی اور یکسوئی سے کام کیا کہ آپ کی مزید تین ماہ کے لیے تقرر کی معیاد بڑھادی گئی مگر اس بار چیف پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے تقرر کیا گیا تھا۔ محمد علی جناح میں سیاسی بیداری کی داغ بیل تو لندن میں برطانوی وزیراعظم کے متعصبانہ بیان سے پڑ چکی تھی۔ دادا بھائی نورو جی اور برطانوی وزیراعظم کی چپقلش کی وجہ نے محمد علی جناح میں سیاسی بیداری پیدا کر دی تھی۔ ان میں احساس پیدا ہوا کہ انگریز جو دھوکے سے برصغیر پر قابض ہوئے اور برس ہا برس سے ہندوستانیوں پر ظلم وستم کرتے چلے آ رہے ہیں، ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں اور اس کے نوادرات پر قبضہ جما چکے ہیں اور ہندوستان کی تمام قیمتی اور نایاب اشیا اپنے ملک برطانیہ میں منتقل کر چکے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہ ہندوستان کے تمام عوام کو کالی نسل قرار دیتے ہیں یعنی کم تر اور حقیر سمجھتے ہیں۔ اس سوچ کی وجہ سے محمد علی جناح قومی اور بین الاقوامی امور پر غور کرنے لگے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے اثرات بھی ان کے سامنے تھے جسے انگریزوں نے غدر کا نام دے کر مسلمانِ ہند کا جینا حرام کر دیا تھا۔ ان پر روزگار کے دروازے بند کر دیئے تھے، ان کے کاروبار کو ٹھپ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی تھی۔ محمد علی جناح سوچنے لگے کہ آئندہ ہندوستان کی عوام کا مستقبل کیا ہوگا۔ محمد علی جناح کے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے عوام جس قدر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انگریز حکومت ان کو اسی شدت سے کچل دیتی ہے۔ ہندوستان کے عوام کی دن بہ دن گرتی صورتِ حال پر وہ افسوس کر کے رہ جاتے تھے۔ اب محمد علی جناح سوچ رہے تھے کہ اس صورتِ حال میں ہمارا کیا فرض ہونا چاہیے اور ہمیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔

جب محمد علی جناح لندن گئے تھے تو ذہن میں کوئی سیاسی خیال نہ تھا۔ مگر وہاں برطانوی وزیرِاعظم کے متعصبانہ رویے نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سمجھ گئے تھے کہ جب انگریز سربراہ کے ذہن میں ہندوستانی عوام کے لیے اس قدر نفرت کا جذبہ کارفرما ہے تو وہاں کے صاحبِ اقتدار افراد کے اذہان و قلوب میں کیسی کیسی رنجشیں نہ ہوں گی۔ ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے محمد علی جناح نے نہ صرف سیاسی معاملات میں دل چسپی لینی شروع کی بلکہ سیاست میں عملاً قدم رکھ دیا۔ یہی سے محمد علی جناح کے سیاسی سفر کا آغاز ہوتا ہے۔

اس وقت ہندوستان میں انگریزوں نے یہ حالات پیدا کر دیئے تھے کہ وہ ہندو اور مسلم کو لڑوا کر اپنی حکومت کو مزید مستحکم بنا چکے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو نوازنے اور مسلمانوں کو دھتکارنے کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ وہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی نفرت مختلف حیلوں سے پیدا کر چکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان بادشاہ کئی سو سال ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے۔ اسی لیے انگریزوں کو سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں ہی سے تھا۔ ہندو تو انگریزوں کے غلام بن چکے تھے مگر اکثر مسلمان انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے تحریکیں چلاتے رہتے تھے۔ مسلمانوں کی پستی میں سب سے بڑا ہاتھ انگریزوں، پھر ہندوؤں اور سب سے آخر میں ان غداروں کا ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے غداری کے مرتکب ہوئے۔ اسی لیے انگریز چاہتے تھے کہ ہر طرح اور ہر طرف سے مسلمان کو کچلا جائے اور انہیں کسی بھی طور پر سر اُٹھانے کا موقع نہ دیا جائے۔ لہٰذا انگریز ہندوؤں پر کرم نوازی کرتے چلے گئے۔ ان کو مضبوط کرتے رہے اور ہندوؤں سے مل کر مسلمان کو نہ صرف کمزور کرتے رہے بلکہ ان کو کچلتے رہے۔

ان حالات میں محمد علی جناح نے سیاست میں قدم رکھا۔ جب ہندوستان میں انگریزوں نے انگریزی زبان کی تعلیم کو عام کر دیا۔ مسلمان انگریزی تعلیم سے بڑی نفرت کرتے تھے جس کی وجہ سے وہ مزید پستی کا شکار ہوتے چلے گئے اور ابتری کی حالت کو پہنچ گئے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے سرسید احمد خان نے جو تحریک چلائی اس سے مسلمانانِ ہند کو بڑی تقویت ملی، سرسید احمد خان نے کہا کہ مسلمانانِ ہند کو اگر آزادی حاصل کرنی ہے۔ ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے اور عہدِ حاضر کے شانہ بہ شانہ چلنا ہے تو انگریزی تعلیم حاصل کرنا ہوگی تاکہ وہ ملازمتیں بھی حاصل کر سکیں

اور کاروبار بھی جما سکیں۔ اسی لیے سر سید احمد خان نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے علی گڑھ میں دار العلوم قائم کیا اور مسلمانانِ ہند کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب کیا۔

ادھر محمد علی جناح نے مسلمانوں کی حمایت میں سیاسی اجتماعات کرنے شروع کیے۔ مگر عجب عجب سی دشواریاں سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی جس میں وہ لوگ شامل تھے جو انگریزی تعلیم کے خلاف تھے انہوں نے سر سید احمد خان کی قدم قدم پر مخالفت شروع کر دی اب سر سید احمد خان کو نہ صرف اغیار سے بلکہ اپنوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ یہ بات انگریزی حکومت کے حق میں تھی۔ انہوں نے ہندوؤں کو اُکسایا اور مسلمانوں کو دبایا۔ اس دشمنی میں ہندوستان بھر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے جن میں لاکھوں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ان فسادات کا اثر انگریزی حکومت پر بھی ہوا۔

مسلمانانِ برصغیر سوچنے لگے کہ ہماری جدوجہد اور مسلسل تگ و دو سے انگریزوں کو اس برصغیر سے نکال بھی دیا تو پھر ہمارا مقابلہ ہندوؤں سے ہوگا جو ہمیں کسی صورت جینے نہیں دیں گے لہٰذا اس فکر میں سرگرداں رہ کر مسلمانوں کے اکابرینِ ملت نے سر جوڑ کر سوچنا شروع کر دیا۔ یہاں سے انہوں نے ایک علاحدہ وطن کا نعرہ لگایا اور انگریز حکومت کو بتایا کہ ہم دو قومیں ہیں جن کے طرزِ زندگی، رہن سہن، رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت کے ساتھ ساتھ مذہب و عقائد اور عبادات کے طریقے مختلف ہیں لہٰذا ہمیں ایک آزاد اور علاحدہ مملکت درکار ہیں جہاں ہم اپنی عبادات اور رہن سہن کو آزادانہ ماحول میں قائم کر سکیں۔

یہ بہت بڑا کام تھا اس بڑے کام کے لیے کسی بڑے لیڈر کی ضرورت تھی لہٰذا مسلمانانِ برصغیر کی نظر محمد علی جناح پر جا ٹھہری۔ دوسری طرف محمد علی جناح بھی اس حالت دو واقعے کی طرف توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے۔ لہٰذا کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا اور محمد علی جناح کے حوالے اس کی قیادت کی گئی۔ یوں محمد علی جناح نے بہ حیثیت قائد اعظم مسلم لیگ کی باگ دوڑ سنبھالی اور جم کر اور کھل کر ایک علاحدہ مملکت حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ قائد اعظم محمد علی جناح کا یہ سیاسی سفر اس نہج تک پہنچ گیا کہ انگریز ہر قدم پر ان سے شکست کھانے لگے اور ہندو لیڈر تمام تر مکاریوں، دھوکا بازیوں اور سازشوں کے باوجود نیچا دیکھنے لگے۔

ہندوستان کے عوام پہلے ہی قائداعظم محمد علی جناح کی قانونی علمی استعداد، تعلیمی قابلیت، ذہنی صلاحیت اور خداداد صلاحیت کے متصرف تھے اب ان کی عملی کاروائیاں بھی منظرِ عام پر آنے لگیں۔اب مسلمانانِ برصغیر کا زور بڑھتا جارہا تھا اور ادھر ہندو اور انگریز مسلسل پریشان رہنے لگے تھے۔لہٰذا انگریزوں نے سوچا کہ اب اس ملک کو چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

یہ قائداعظم محمد علی جناح کی حکمتِ عملی اور سیاسی بصیرت تھی کہ آج ہم ایک آزاد اور خداداد مملکت میں سانس لے رہے ہیں۔ قائداعظم نے جس قدر محنت، جاں فشانی اور یک سوئی اور اخلاص سے کام کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ کام وہی کرسکتا تھا جس کو خدا نے اس کام کے لیے چن لیا تھا۔ دنیا نے دیکھا کہ ایک سچے انسان، پکے مسلمان، ایمان دار و دیانت دار فرد، مخلص، رہبر و راہ نما اور محبِ وطن انسان نے جاں نثاری اور سرفروشی سے مسلمانانِ برصغیر کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کیا اور آج لاکھوں، کروڑوں مسلمان ان کی محنت کا ثمرہ حاصل کررہے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین۔

•••

محسنِ ملت

حرا شبیر

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اِس دنیائے فانی سے چلے جانے کے بعد بھی لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اپنے کیے گئے کارناموں اور اچھے اعمال کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کا شمار بھی اُن عظیم افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے پوری دنیا کے سامنے عملی جدوجہد کی مثال قائم کی اور برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ ریاست کے تصور کو حقیقت کا روپ دیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جب مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو اُس وقت برصغیر کے مسلمانوں کے سامنے کوئی واضح حکمتِ عملی نہ تھی، وہ تقسیم تھے، اُنہیں ایک ایسے رہنما کی ضرورت تھی جو ملت کی تشکیل کر سکے۔ اللہ پاک نے برصغیر کے مسلمانوں کو قائداعظم محمد علی جناح کی صورت میں ایک ایسا رہنما دیا جس نے اپنی کوششوں سے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا، اُنہیں جھنجھوڑا اور ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ قائداعظم نے پوری دنیا کے سامنے ایک ایسی مثال قائم کی جس نے تاریخ کا رخ ہی بدل دیا۔

''جناح آف پاکستان'' کے مصنف ''پروفیسر اسٹین لے'' یونیورسٹی آف کیلی فورنیا امریکا اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کا دھاوا بول دیتے ہیں اور ایسے لوگ تو اور بھی کم ہوتے ہیں جو دنیا کا نقشہ بدل کر رکھ دیتے ہیں اور ایسا تو کوئی کوئی ہوتا ہے جو ایک نئی مملکت قائم کر دے۔ محمد علی جناح ایک ایسی شخصیت ہیں جنہوں نے بہ یک وقت تینوں کارنامے کر دکھائے۔''

قائداعظم محمد علی جناح مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، اِس کامیابی کے پیچھے نہ صرف اُن کی عملی جدوجہد اور کوششیں شامل تھیں بلکہ اُن کی شخصیت میں چھپی خوبیوں نے بھی اِس عظیم مقصد کو حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جن میں سے چند خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ کسی بھی مقصد کے حصول میں وقت کی پابندی نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہے، قائداعظم وقت کی پابندی پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ پاکستان حاصل کر لینے کے بعد بھی اُنہوں نے وقت کی پابندی کا ہر موقع پر خیال رکھا، اِس بات کا اندازہ اِس واقعے سے بخوبی ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر اُس وقت کے وزیراعظم جناب لیاقت علی خان کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ ٹھیک وقت پر پروگرام شروع کرا دیا۔

قائداعظم محمد علی جناح نہ صرف ایک اعلیٰ ظرف انسان بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ اُصول پسند بھی بے حد تھے۔ وکالت کے پیشے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی اُنہوں نے اپنی اُصول پسندی پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا بلکہ اپنے بنائے ہوئے اُصولوں پر قائم رہے اور حد سے تجاوز نہ کیا۔ وہ صرف جائز معاوضہ لیتے تھے اور رشوت کو ایک ناسور سمجھتے تھے۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ نے قائداعظم محمد علی جناح کے متعلق کہا تھا:

"محمد علی جناح کو نہ تو خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ شخص خیانت کر سکتا ہے۔"

قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وطنِ عزیز میں انصاف کا بول بالا ہو۔ امیر غریب کی تفریق نہ ہو۔ تمام افراد آپس میں مل جل کر اتحاد اور یکجہتی سے رہیں۔ ہر فرد کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہو۔ قائداعظم جمہوریت کے حامی تھے اور آمریت پر یقین نہ رکھتے تھے۔ اُن کے بارے میں چند سیاسی حلقوں کی جانب سے یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ وہ آمریت کی طرف مائل تھے۔ اُن کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا کہ اُن کا مزاج آمرانہ تھا جب کہ حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ حال ہی میں ضیا شاہد نے قائداعظم کی زندگی کے دلچسپ واقعات پر ایک کتاب "سچا اور کھرا لیڈر" لکھی ہے۔ اِس کتاب میں اُنہوں نے اسٹیٹ بینک کے سابق سربراہ ممتاز حسن سے قائداعظم کی ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ ممتاز حسن کے مطابق ہندوستان کے سیاسی حلقوں کے حوالے سے اکثر سننے میں آیا ہے کہ جناب

محمد علی جناح کی طبیعت آمریت کی طرف مائل تھی اور وہ دوسروں کی بات سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ممتاز حسن کا کہنا ہے کہ قائداعظم کی شخصیت پر اِس سے بڑا بہتان نہیں تراشا جاسکتا کیونکہ قائداعظم تو سرتاپا جمہوریت تھے اور مخالف کی بات سننا اور اِس پر غور کرنا جمہوریت کا خاصہ ہے۔

''کے۔ایچ خورشید'' کے مطابق:

> ''قائداعظم کام میں کوتاہی یا بے اُصولی برداشت نہیں کرتے تھے اور جس شخص سے بھی ایسی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اُس کا سختی سے نوٹس لیتے تھے۔''

محمد علی جناح ایک سچے اور کھرے لیڈر تھے۔ اُنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے دن رات کوششیں کیں اور پیغامِ تحریکِ پاکستان کو گلی گلی پہنچایا جس کے باعث تمام مسلمان جس میں عورتیں، بچے، جوان اور بوڑھے سب شامل تھے یکساں جوش وخروش سے آگے بڑھے اور دنیا کے نقشے پر ایک ایسی آزاد مملکت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جسے مذہب اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا۔ اگرچہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا اور محمد علی جناح بھی پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے تاہم قائداعظم کی 11/اگست 1947ء کی دستور ساز اسمبلی میں کی گئی تقریر کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جس میں اُنہوں نے کہا تھا:

> ''آپ آزاد ہیں، آپ آزاد ہیں، اپنے مندروں میں جانے کے لیے۔ آپ آزاد ہیں اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے اور ریاست پاکستان اپنی کسی بھی عبادت گاہ میں جانے کے لیے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو، ریاست کا اِس سے کوئی لینا دینا نہیں۔''

محمد علی جناح چاہتے تھے کہ سرزمینِ پاکستان پر ہر شہری کو بلاتفریق مذہب اور ذات پات کے برابری کے حقوق حاصل ہوں اور وہ آزاد فضاؤں میں سانس لے سکیں۔ حصولِ پاکستان کی خاطر محمد علی جناح نے اپنی بیماری بھی دنیا سے چھپائے رکھی۔ وہ ۱۹۳۰ء سے تپ دق کا شکار تھے لیکن یہ بات صرف اُن کی ہمشیرہ ''محترمہ فاطمہ جناح'' اور چند قریبی ساتھیوں کو معلوم تھی۔

قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ: محمد علی جناح نے پاکستان کو سہارا دینے کے لیے قیامِ پاکستان کے بعد سخت بیماری میں بھی جنون کی حد تک کام کیا اور اپنی صحت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ آپ کی جہدِ مسلسل اور خدمات کے نتیجے میں آپ کو ''بابائے قوم'' یعنی ''قوم کا باپ'' کا خطاب دیا گیا۔ قائداعظم وہ عظیم لیڈر ہیں جن کے متعلق ''کارڈ ماؤنٹ بیٹن'' نے کہا کہ اگر انہیں قائداعظم کی خرابیِ صحت کا معلوم ہوتا تو یقیناً وہ اُن کی موت تک انتظار کرتے اور اِس طرح تقسیم سے بچا جا سکتا تھا۔

محمد علی جناح بلند کردار کے حامل انسان تھے۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل اُنہوں نے 30ر جولائی 1948ء کو لاہور میں اسکاؤٹ ریلی سے خطاب کیا۔ اِس خطاب کا کچھ حصہ پیشِ خدمت ہے جو اُن کے کردار کی سچائی کا غماز ہے:

> ''میں نے بہت دنیا دیکھ لی۔ اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت، شہرت بھی بے حساب دی۔ اب میری زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ مسلمانوں کو باوقار و سربلند دیکھوں۔ میری خواہش ہے کہ جب مروں تو میرا دل گواہی دے کہ جناح نے اللہ کے دینِ اسلام سے خیانت اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمت سے غداری نہیں کی۔ مسلمانوں کی آزادی، تنظیم، اتحاد اور مدافعت میں اپنا کردار ٹھیک ٹھیک ادا کیا اور میرا اللہ کہے کہ اے میرے بندے! بے شک تو مسلمان پیدا ہوا۔ بے شک تو مسلمان مرا۔''

(''پاکستان بنانے کا مقصد (افکارِ اقبال و قائداعظم کی روشنی میں)'' از حکیم سید محمود احمد)

قائداعظم کا شمار ایسے رہنماؤں میں ہوتا ہے جو اپنے غیر معمولی شخصی اوصاف اور تدبر کے باعث زمانے بھر پر اثر انداز ہوئے اور حالات کا رخ موڑ دیا۔ بابائے قوم آخری دم تک ملک و ملت کی تعمیر میں مصروفِ عمل رہے۔ وہ وطنِ عزیز کے استحکام کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن اُن کی صحت دن بہ دن گرتی گئی۔ وفات سے چند مہینے قبل قائداعظم کے جسم میں ٹی بی کی موجودگی اور پھیپھڑوں کے سرطان کا انکشاف ہوا پھر اُن کی طبیعت سنبھل نہ سکی۔ 9ر ستمبر کو محمد علی

جناح کو نمونیا نے آ گھیرا اور بالآخر 11 ستمبر 1948ء میں دنیا بھر کو حیران کر دینے والا یہ عظیم لیڈر اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔ بلاشبہ ایسے لیڈر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ممتاز عالمِ دین ''علامہ شبیر احمد عثمانی'' جنہوں نے قائداعظم کی نمازِ جنازہ پڑھائی نے قائداعظم کے متعلق فرمایا:

''شہنشاہ اورنگزیب کے بعد ہندوستان نے اتنا بڑا مسلمان
لیڈر پیدا نہیں کیا جس کے غیر متزلزل ایمان اور اٹل ارادے نے دس کروڑ
شکست خوردہ مسلمانوں کو کامرانیوں میں بدل دیا ہو۔''

محمد علی جناح کی خواہش تھی کہ پاکستانی معاشرہ انصاف، رواداری، استحصال سے پاک اور بھائی چارے پر مبنی ہو۔ قدرت نے اُنہیں موقع نہ دیا اور وہ قیامِ پاکستان کے کچھ عرصے بعد ہی اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنی خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ تاہم وطنِ عزیز سے سچی محبت کرنے والوں کے دلوں میں آج بھی اُمید کی شمع روشن ہے۔ اُنہیں اِس بات پر یقین ہے کہ انشاء اللہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب پاکستان میں قانون کی پاس داری ہوگی۔ انصاف کا بول بالا ہو گا۔ ملک میں رہنے والے تمام افراد بنیادی سہولیات سے محروم نہ ہوں گے۔ لیکن اِس خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عملی طور پر کوششوں کی ضرورت ہے۔ پاکستان کو مثالی اور اسلامی فلاحی ریاست بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قائداعظم محمد علی جناح کے فرمودات کی روشنی میں اپنا لائحۂ عمل مرتب کریں، اُن کے اُصولوں کو اپنائیں، اپنی نوجوان نسل کو اپنے عظیم لیڈروں کی اُن قربانیوں اور کوششوں کے متعلق آگاہی دیں جو اُنہوں نے آزاد مملکت حاصل کرنے کے لیے دن رات کیں۔ ابتدائی سطح سے لے کر ثانوی سطح تک ہمارے ان لیڈروں کی شخصیت اور اُن کی زندگی سے متعلق واقعات شاملِ نصاب ہوں تاکہ طلبا و طالبات یہ جان سکیں کہ پاکستان کتنی مشکلات سے گزرنے کے بعد وجود میں آیا۔ قائداعظم کے نام: ''شاعر لکھنوی'' کا شعر:

تو نے انعام دیا ہمیں آزادی کا
ناز کرتے ہیں تجھے قائداعظم کہہ کے

•••

فرمودات قائداور آج کا پاکستان

اعجاز بابو خاں

بانیِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح عالمِ اسلام کے ایک عظیم رہنما، مدبر، سیاست دان اور ہر دل عزیز شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی بے پناہ ذہانت، قابلیت اور اعلیٰ بصیرت سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک الگ مسلم ریاست پاکستان حاصل کیا۔ مملکتِ خداداد پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی عملی جدوجہد اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی عظیم جانی و مالی قربانیوں کا ثمر اور زندہ و جاوید حقیقت ہے جو انشاءاللہ تا قیامت قائم رہے گا اور پاکستان کے ساتھ قائد اعظم کا نام بھی ہمیشہ آسمان پر رات کو ماہ تاب اور دن میں مہرِ منور کی طرح جگمگاتا رہے گا۔ قائد اعظم محمد علی جناح علم ودانش اور فہم وفراست سے مالا مال روشن خیال اور عوام الناس میں مقبول رہنما تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ عوامی فلاح و بہبود اور عوامی حقوق کی بات کی۔ اُن کے فرمودات آج بھی ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ عظیم قومیں اپنے رہنماؤں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں اور ان کے دیے گئے اصولوں پر عمل کرنا فرض اپنا سمجھتی ہیں لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم قائد اعظم کا دن تو مناتے ہیں، قائد اعظم کے ارشادات پر عمل نہیں کرتے۔

قائد اعظم محمد علی جناح غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ذہین اور باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ زمانے کی ضروریات کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے۔ اگر قائد اعظم کے فرمودات کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ جیسے اُنہوں نے آج کے پاکستان کے مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا بہترین حل تجویز کیا ہے۔ اس مضمون میں قائد اعظم کے اُن اقوال کو پیش کیا جارہا ہے جن کا تعلق پاکستان کے آج کے مسائل سے ہے۔ ان اقوال کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہی ہے کہ

مسائل کا حل تو موجود ہے لیکن ان پر عمل نہیں کیا جا رہا۔ اگر ان تجاویز وفرمودات پر ایمان داری سے عمل کیا جائے تو کوئی مشکل نہیں کہ پاکستان دنیا کی عظیم ترین قوم بن جائے۔ چند اقوال دیکھیے:

(۱) مسلمان گروہوں اور فرقوں کی نہیں بلکہ اسلام اور قوم کی محبت پیدا کریں کیوں کہ ان برائیوں نے مسلمانوں کو دو برس سے کمزور کر رکھا ہے۔

(مسلم لیگ کا تیسویں سالانہ اجلاس، دہلی)

(۲) ہم سب پاکستانی ہیں اور ہم میں سے کوئی بھی سندھی، بلوچی، بنگالی، پٹھان یا پنجابی نہیں ہے۔ ہمیں صرف اور صرف اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔

(15/جون 1948ء)

(۳) مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اتحاد، یقین محکم اور تنظیم ہی وہ بنیادی نکات ہیں جو نہ صرف یہ کہ ہمیں دنیا کی پانچویں بڑی قوم بنائے رکھیں گے بلکہ دنیا کی کسی بھی قوم سے بہتر قوم بنائیں گے۔

(28/دسمبر 1947ء)

(۴) انصاف اور مساوات میرے رہنما اصول ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی حمایت اور تعاون سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ہم پاکستان کو دنیا کی سب سے عظیم قوم بنا سکتے ہیں۔

(قانون ساز اسمبلی، 11/اگست 1947ء)

مذکورہ اقوال میں پہلا قول قائداعظم کی دور اندیشی اور اعلیٰ بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ بات انہوں نے مسلم لیگ کے تیسویں سالانہ اجلاس کے موقع پر دہلی میں کہی تھی۔ یہ بات آج بھی ہم پر پوری اُترتی ہے، ہم اسلام کا بنیادی حکم مساوات کو بھلا کر گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو گئے ہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر صوبائی، علاقائی، لسانی اور مسلکی تفرقوں میں بٹ گئے ہیں جس سے قومی یکجہتی متاثر ہوئی ہے اور ہم بحیثیت قوم کمزور ہو گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم نے خود کو آج بھی نہیں بدلا تو ہم آئندہ بھی اسی طرح کمزور قوموں میں شامل رہیں گے۔

دوسرے قول سے بھی ہمارے ملک کی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہم سندھی، پنجابی، بلوچ، مہاجر اور پٹھان تو ہیں لیکن پاکستانی نہیں ہیں۔ جبکہ ہماری بنیاد پاکستان ہے اور ہمیں پاکستانی بننا

چاہیے اور مل کر ملک کے روشن مستقبل کی ضمانت بننا چاہیے۔

تیسرے قول میں قائداعظم نے ہمیں ترقی کرنے کے اصول بتائے ہیں جن پر عمل کرنے سے ترقی لازمی ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم نے قائداعظم کے اصولوں پر آج تک سنجیدگی سے عمل نہیں کیا ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ہم دنیا کی عظیم ترین قوموں میں شامل ہوسکیں۔

چوتھا قول ایک بہترین اسلامی فلاحی ریاست کے تصور کو پیش کرتا ہے جہاں مساوات اور انصاف کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ آج بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ پاکستان میں عوام کئی طبقوں میں بٹی ہوئی ہے اور انصاف بھی ہر طبقے کے لیے علاحدہ علاحدہ طرح کا ہے۔ ایسے میں یہ کیوں کر ممکن ہے کہ ایک عام سافرد پاکستان کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے قیامِ پاکستان کے وقت قانون ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان میں مذہبی آزادی کا تصور پیش کیا اور تمام قوموں کو اپنے اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد قرار دے دیا تھا اور واضح کیا تھا کہ ریاست کو کسی بھی مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا:

> ''آپ آزاد ہیں۔ آپ آزاد ہیں اپنے مندروں میں جانے کے لیے، آپ آزاد ہیں اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، ذات یا نسل سے ہو، ریاست کا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔''

قولِ بالا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس عظیم الشان فرمان کا عکس ہے جو اُنہوں نے فتحِ مکہ کے وقت اہلِ مکہ سے فرمایا تھا اور جس میں دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے عقائد کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے آزاد قرار دیا تھا۔ اگر قائداعظم کے فرمان کو آج کے پاکستان کی روشنی میں دیکھیں تو صورتِ حال بالکل مختلف دکھائی دیتی ہے۔ دیگر مذاہب کیا، ایک طرف خود مسلمان آپس میں مسلکی جھگڑوں کو بنیاد بنا کر ایک دسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔ فرقہ ورانہ شدت پسندی اور عدم برداشت کے زاویے نے ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ ایسے میں ایسے معتدل رویے کی ضرورت ہے جس سے سب کو مساوی حقوق کی ضمانت مل سکے۔

قائداعظم محمد علی جناح روشن خیال، دور اندیش اور معاشرے میں بدلتے ہوئے رجحانات کا

گہرا شعور رکھتے تھے۔ وہ خواتین کو بھی مردوں کی طرح یکساں اہمیت دیتے تھے۔ تحریکِ آزادی کے لیے قائداعظم نے خواتین کے کردار کو نہ صرف سراہا بلکہ اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کو عملی سیاست میں اپنے ساتھ شامل کر کے خواتین کے لیے مثال بھی قائم کی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 1944ء میں مسلم یونیورسٹی یونین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> "دنیا کی کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ معاشرے کی تعمیر و ترقی میں حصہ نہ لیں۔ عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کرنے والے انسانیت کے دشمن ہیں۔"

قائداعظم محمد علی جناح کے قولِ بالا سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قائداعظم آنے والے زمانے کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ آج یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جن قوموں میں خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ ملک کی تعمیر و ترقی میں کام کیا وہ قومیں ترقی کی منازل طے کر چکی ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح کا اہم نظریہ یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی حقوق سے بہرہ ور کر کے ان کو آزادی کی نعمت سے ہمکنار کرنے کے ساتھ ساتھ باوقار شہری بنایا جائے۔ انہوں نے مایوسی اور ناامیدی کی فضا میں عزم و حوصلہ کا چراغ جلایا اور اپنی لیاقت، ہمت اور معاملہ فہمی سے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کے فکر و فلسفہ اور نظریات کو بھولنا بڑی بدقسمتی ہے۔ قائداعظم کے پیش کیے گئے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے ہم حقیقی معنوں میں پاکستان کو مثالی فلاحی ریاست بنا سکتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے فرمودات پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں ہر ممکن حصہ لیں اور قائداعظم کے خواب کو تعبیر سے ہمکنار کریں۔

•••

ترجمہ

میرے بھائی جان

(My Brother)

مصنفہ: محترمہ فاطمہ جناح

مترجم: ابوالفرح ہمایوں

پیش لفظ:

سات بھائی بہنوں میں سے فاطمہ جناح، قائداعظم محمد علی جناح کی تیسری بہن تھیں (1967 - 1893) جو کہ ان سے کافی مشابہت رکھتی تھیں۔ ذاتی زندگی میں بھی وہ اُن کے بے حد قریب رہیں۔ اُن کے والد جناح پونجا 1901ء میں انتقال کر گئے تب جناح نے اُن کی سرپرستی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ انہوں نے فاطمہ کی تعلیم و تربیت پر بھرپور توجہ دی۔ اُن کی مکمل حمایت اور تعاون کا یہ نتیجہ تھا کہ فاطمہ 1902ء میں باندرہ کانونٹ میں داخل ہو گئیں اور بعد میں ڈاکٹر احمد ڈینٹل کالج کلکتہ میں بھی اُن کو جگہ مل گئی۔ یہ 1919ء کا ذکر ہے، اس کے لیے انہیں خاندانی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ بات خوجہ روایت کے خلاف تھی کہ لڑکیاں کانونٹ میں تعلیم حاصل کریں یا کوئی پیشہ ورانہ ذریعہ اختیار کریں۔ لیکن جب انہوں نے تعلیم مکمل کر لی تو جناح اس بات پر اُن سے متفق ہو گئے کہ ایک دندان سازی کا مطب کھولا جائے۔ انہوں نے 1923ء میں اس کام میں اُن کی مدد کی اور بمبئی میں ایک کلینک کھولا گیا۔

مس جناح 1918ء تک آٹھ سال اپنے بھائی کے ساتھ رہائش پذیر رہیں، جب جناح

نے رتن بائی سے شادی کر لی۔فروری 1929ء میں رتن بائی کی وفات کے بعد مس جناح نے اپنا کلینک بند کر دیا اور پھر جناح کے بنگلے میں واپس آ گئیں اور گھر کا انتظام سنبھال لیا۔اور اس طرح جناح سے رفاقت کا وہ دور شروع ہوا جو اُن کی زندگی تک قائم رہا (11، ستمبر 1948ء)

مس جناح نے اپنے بھائی کے ساتھ زندگی کے اٹھائیس (28) سال گزارے جس میں وہ انیس (19) سال بھی شامل ہیں جو کہ دشوار ترین دور تھا اور اُن کی زندگی کے انتہائی کٹھن مرحلے تھے۔اس عرصے میں قائد معجزانہ طور پر رفتہ رفتہ ایک سیاسی حیثیت اختیار کر گئے۔خاص طور پر اپنی خود ساختہ جلاوطنی 1931ء سے 1934ء تک کے دوران وہ دس کروڑ مسلمانوں کے بلا شرکت غیرے لیڈر تسلیم کر لیے گئے۔انہوں نے مسلم قومیت کی پہچان کے لیے سخت جدوجہد کی اور ان کی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔انہوں نے ثابت کر دیا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور یہی دونوں برصغیر میں طاقت کی مالک ہیں۔

مس جناح نہ کہ صرف اپنے بھائی کے ساتھ رہائش پذیر رہیں بلکہ اُن کے ساتھ مختلف ممالک کے دورے بھی کیے اور اُن کی جدوجہد میں اُن کا ساتھ دے کر اُن کے حوصلے بڑھاتی رہیں۔اس امر کے بھی کئی ثبوت ملتے ہیں کہ مختلف مراحل اور مشکلات میں جناح اپنی بہن سے مشاورت کرتے تھے۔یہ گفتگو عام طور پر ناشتے اور رات کے کھانے کی میز پر ہوا کرتی۔اس طرح مس جناح کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی اور ان کی قوت ارادی مضبوط ہو جاتی۔مس جناح نے ایک بار یہ حوالہ بھی دیا کہ قائد کا اُن کی ہمت افزائی کرنے اور احساس برتری کو اُجاگر کرنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔اور انقلابی دور میں وہی تھے جو ہر دم ہمت افزائی کرتے رہتے تھے۔

جناح کو اپنی خودنوشت لکھنے کی بھی انہوں نے ہی ترغیب دی اور ایک ایک پرانی باتیں یاد کرا کے ان کو بڑی تفصیل کے ساتھ کتاب مکمل کروائی۔بیکٹر لولیتھو کی یہ کتاب ''جناح'' کے عنوان سے پہلی بار 1954ء میں منظر عام پر آئی۔یقیناً یہ ایک شاندار تحریر تھی جس میں جناح نے اپنی یادوں اور پیشہ ورانہ زندگی کے تمام راز کھل کر بیان کیے تھے اور اپنے سیاسی ہم عصروں اور مبصروں کے بارے میں غیر جانبدارانہ رائے دی تھی۔اس میں اُن لوگوں کا ذکر بھی تھا جنھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اُن کو مشورے دیئے تھے اور اُن کا ساتھ دیا تھا۔حالانکہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ

بولیتھو کی ''جناح'' میں محض اُن کی سیاسی کامیابی اور ذاتی حصول کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے فوراً بعد مس جناح نے ایک ایسے پاکستانی مصنف کی تلاش شروع کر دی جو قائد کی زندگی کے حالات تحریر کر سکے کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ مسلم سیاست کی روح کو اور مسلمانوں کے اصل جذبات کو ایک پاکستانی ہی مکمل اور درست طور پر سمجھ سکتا ہے۔ اور تحریک پاکستان کی جدوجہد کے بارے میں ترجمانی کر سکتا ہے کہ جو کچھ 1937ء سے 1947ء کے عشرے میں گزرا اور قائد کے مشن سے صحیح انصاف کر سکتا ہے۔ ان کی پہلی ترجیح کے طور پر پروفیسر عطرت حسین زبیری سابق پرنسپل اسلامیہ کالج کلکتہ تھے جو کہ بعد میں وائس چانسلر راج شاہی یونیورسٹی ہوئے۔ جب کسی سبب سے زبیری صاحب 1958-59ء میں امریکا چلے گئے تو ان کی نظر ایم۔ آر۔ کیانی پر پڑی۔ مگر اچانک 15، نومبر 1962ء کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ اور تب انہوں نے مسٹر جی الانہ کا انتخاب کیا۔ تقریباً اٹھارہ ماہ تک مسٹر الانہ، مس جناح کی معاونت کرتے رہے، مگر پھر 1964ء کے اواخر میں جب وہ صدر ایوب کے مقابلے میں ایک مخالف لیڈر کی حیثیت سے سامنے آئیں تو ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ وجوہات کیا تھیں، یہ اب تک ایک راز ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان واقعات پر دونوں میں سے کسی نے اپنی زبان نہیں کھولی۔ لیکن مس جناح اپنی وفات 8، جولائی 1967ء تک اس خودنوشت مجموعے کی تکمیل کے لیے ایک مصنف یا مرتب کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ دوسری طرف جی الانہ اپنے کام میں ثابت قدم رہے اور مس جناح کی وفات کے بعد ایک کتاب ''قائد اعظم جناح۔ ایک قوم کی داستان'' (Quaid-e-Azam Jinnah: The Story of a Nation) منظر عام پر لے آئے۔ آج کی تاریخ تک جناح کی یہ ایک بہترین سوانح حیات ہے جو کسی پاکستانی نے لکھی۔

موجودہ مسودہ مس جناح کی وفات کے بعد موہٹا پیلس سے قائد اعظم پیپرز کے ساتھ دریافت ہوا اور اسلام آباد میں پاکستان کے سرکاری کاغذات میں موجود تھا۔ خیال اغلب ہے کہ یہ 1963-64ء کے زمانے میں لکھا گیا۔ اس کے سرورق پر یہ تحریر ہے کہ یہ کام ''فاطمہ جناح نے جی الانہ کے تعاون سے مکمل کیا۔''

واضح طور پر نظر آتا ہے کہ مس جناح یہ اطلاعات مسٹر جی الانہ کو بہم پہنچاتی ہوں گی اور ان کو

اس قابل بنایا گیا ہوگا کہ یہ پڑھنے کے لائق ہو سکیں۔ یہ امکان دو حقیقتوں پر مبنی ہے جیسا کہ موجودہ ایڈیٹر سمجھ سکے ہیں۔ اول، مسٹر الانہ جو 1963ء میں سوانح عمری لکھتے وقت معلومات حاصل کر رہے ہوں گے اور جو کچھ انہیں دیگر ذرائع سے معلوم ہوا۔ پہلے دو باب اُن کے خاندانی تفصیل سے متعلق ہیں جو کہ مس جناح نے بتائے ہوں گے۔ دوم، بہت سے مقامات پر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے جو کہ اس مسودے کی تکمیل کے لیے ضروری تھے۔

یہ مسودہ ان ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں خاندانی پس منظر اور بچپن کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں وہ جدوجہد بیان کی گئی ہے جب وہ وکالت کے دوران اپنی تقدیر بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور تیسرے باب کا تعلق قائد اعظم کی زندگی کے آخری چند سالوں سے ہے۔ خصوصاً اُن خدمات کا ذکر جو انہوں نے اپنی کمزور اور خراب صحت کے باوجود پاکستان کے لیے انجام دیں۔

دوسرے اور تیسرے باب میں اگر چہ کہیں کہیں پر جھول موجود ہے مگر ان پر کافی حد تک وہ مواد موجود ہے جہاں الٰہی بخش نے تصدیق کی ہے اور بتایا ہے کہ اُن کی بیماری کس درجے پر تھی۔ اس حصے کا عنوان ہے ''قائد اعظم کے ساتھ اُن کی بیماری کے آخری چند روز'' 1949ء

اس مسودے میں اطلاعات کے ایک اہم ذریعہ کی دریافت ہوئی ہے جو جناح کی اوائل زندگی کے بارے میں ہے۔ اس ادبی تخلیق میں بتایا گیا ہے کہ وہ شروع سے تحقیق میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس بات کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اسٹینلے والپورٹ (Stanley Wolpert) نے اپنی کتاب ''جناح آف پاکستان'' 1984ء میں کافی خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ایک نظر ثانی شدہ یا مسودے کا خلاصہ بھی ''پاکستان: ماضی اور مستقبل 1977ء) میں ''ایک ہمشیرہ کی یادداشت'' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ مگر تحقیقی کام کے لیے یہ ایک حد تک ناقص ہے۔

موجودہ کتاب کافی محنت سے مرتب کی گئی ہے اور صرف ایک متنازع بات کے یہ مسودہ کافی حد تک سچ اور درست ہے۔ بہر حال ان صفحات میں قائد اعظم کے بارے میں جو باتیں لکھی گئی ہیں، ان پر مس جناح نے ایک بار اچھی طرح نگاہ ڈالی ہے اور اپنی یادداشت اور پرانی ڈائریوں کو مناسب انداز میں کھنگالا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک حکایت یا داستان بن گئی ہے۔ جہاں جہاں

غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ وہاں فٹ نوٹ میں وضاحت کردی گئی ہے۔قائداعظم کی تقریروں سے اقتباسات، مختلف شائع شدہ تقریروں کے ساتھ جانچ لی گئی ہیں (باقاعدہ تحریروں سے بھی موازنہ کرلیا گیا ہے۔) اور اصل مسودے سے ملالیا گیا ہے۔ جناح کی آخری بیماری کے دوران الٰہی بخش کی کتاب سے اقتباسات، فٹ نوٹس میں درج ہیں اور مس جناح کے خیالات کے مقابل موجود ہیں۔

پندرہ دستاویزات موجودہ آپ بیتی میں شامل کردیے گئے ہیں جو کہ جناح کی اوائل عمری سے متعلق ہیں۔ پہلی، دوسری اور تیسری تصویر سندھ مدرسۃ الاسلام کے رجسٹر سے لی گئی ہیں اور چوتھی کرسچین مشن اسکول سے۔ اس پر تاریخ دس فروری 1896ء کی ہے اور جناح کی لائبریری برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ پانچویں اُن کی وہ درخواست ہے جو 25، اپریل 1893ء کو آنریبل سوسائٹی آف لنکنز کو بھیجی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ابتدائی امتحان میں جو لاطینی حصہ ہے، وہ اس کو نہیں سمجھ سکتے ہیں، لہٰذا وہ حصہ نکال دیا جائے۔ چھٹی تصویر میں لنکنز ان نے اطلاع دی ہے کہی ''ان کی درخواست منظور کرلی گئی ہے۔''

ساتویں تصویر میں ان کی طرف سے 25 مئی 1893ء کو یہ اطلاع دی گئی ہے کہ ''بار میں ایڈمیشن کال کے لیے ان کا نام منظور کرلیا گیا ہے۔'' آٹھویں تصویر میں بتایا گیا ہے کہ ان کا نام محمد علی جناح سوسائٹی کی کتاب میں درج کرلیا گیا ہے (14، اپریل 1896ء) کی خبر میں مطلع کیا گیا ہے (11، مئی 1896ء) کہ ''ایک سرٹیفکیٹ اُن کو بخشا گیا ہے کہ بار میں داخلے کے لیے اُن کو دعوت دی جائے گی۔'' دسویں تصویر اُس سرٹیفکیٹ کی ہے جو انہیں لنکنز ان کی جانب سے نوازی گئی اور جس میں انہیں بتایا گیا کہ 5، جون 1893ء کو وہ لنکنز ان میں داخل کرلیے گیے ہیں اور بار میں انہیں 29، اپریل 1896ء کو حاضر ہونا ہے۔ گیارہ اور بارہ نمبر کے دو سرٹیفکیٹ ان کے استاد سر ہاورڈ ڈبلیو ایلفنسٹن اور ڈبلیو ڈگلس ایڈورڈ (Sir Howard W. Elphnistone and W. Douglas Edward) مورخہ 5 اور 6 مارچ 1896ء نے جاری کیے۔ تیرہویں تصویر 18، اگست 1896ء کی درخواست کی ہے جو کہ رجسٹرار بمبئی ہائی کورٹ میں پیش کی گئی جس میں گزارش کی گئی ہے کہ ان کو بطور وکیل داخلے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ نمبر چودہ (14)

پی۔وی۔اسمتھ (P.V. Smith) کا ایک کیریکٹر سرٹیفکیٹ ہے جو کہ مانچسٹر کے چانسلر آف ڈائیوسیز (Chancelor of Diocese) ہیں۔اور پندرہ نمبر بمبئی سول لسٹ کی ہے جس میں ان کو بحیثیت وکیل داخلے کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ہم معذرت خواہ ہیں کہ بارہ اور چودہ نمبر کی دستاویزات کوشش کے باوجود حاصل نہ کر سکے۔پہلی پانچ تصاویر کے علاوہ بقیہ تصاویر اس کتاب میں پہلی بار شائع کی جا رہی ہیں۔امید ہے کہ محققین ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے اور طالب علم بھی مس جناح کے حق میں دعا کریں گے۔

اب ہم ان افراد کا شکریہ ادا کرنا چاہیں گے جنہوں نے موجودہ کتاب کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح ہماری امداد کی۔سب سے پہلے نیشنل آرچیوز آف پاکستان اور اس کے ڈائریکٹر مسٹر عتیق ظفر شیخ کے ہم احسان مند ہیں جنہوں نے مسودے کی فوٹو کاپی اور کئی تصاویر ہمیں عنایت فرمائیں۔ نیشنل ڈاکومنٹس سینٹر لاہور کے مسٹر نذیر احمد بھی خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے مائیکرو فلم بنانے کے لیے ہم سے تعاون کیا۔محمد احمد اور خواجہ رضی حیدر نے کتاب کی تیاری میں مدد کی۔ان تمام کارکردگی کے پس منظر میں میرا بھانجا محمد اکبر بھی پیش پیش رہا اور آخری پانچ تصاویر بمبئی ہائی کورٹ کی لا کر دی۔اس کتاب میں جو تصاویر شامل ہیں، ان میں سے زیادہ تر مجھے اپنے مرحوم لنگوٹیا یار جمیل الدین احمد کے ذخیرے سے حاصل ہوئیں۔میں مرحوم کی بیوہ کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنے قیمتی ذخیرے میں سے یہ تصاویر اکیڈمی کو عنایت فرمائیں۔

کاٹھیاواڑ سے کراچی:

برطانوی حکومت کا سورج انیسویں صدی کے آغاز میں ہی بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔یوں کہیے کہ نصف النہار پر جا پہنچا تھا۔تاجروں کی حیثیت سے برصغیر میں مراعات طلب کرنے والے اب پوری مضبوطی سے قدم جما کر یہاں کے حکمران بن گئے تھے اور انہوں نے سونے کی چڑیا پر قبضہ کر لیا تھا۔انہوں نے یہاں کی رعایا پر بھی جادو کر دیا تھا اور سب بظاہر پر سکون اور مطمئن تھے۔انگریز سمجھ رہے تھے کہ ان کے مہذب سلوک اور بردباری نے ہندوستانی عوام کو رام کر دیا اور اب وہ چوں بھی نہیں کر سکیں گے۔لیکن اندر ہی اندر جو لاوا پک رہا

تھا، وہ اُس سے بے خبر تھے۔ یہ چنگاری 1857ء میں آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی اور بغاوت کی آگ ہر طرف پھیل گئی۔ جدوجہد آزادی کی طرف یہ اہل ہند کا پہلا قدم تھا۔ بے شمار وطن دوست افراد نے اس نیک کام میں اپنی جانوں کی قربانی دی اور شہادت کا مقام حاصل کیا۔

مگر کچھ علاقے ایسے بھی تھے جہاں کے لوگ اردگرد کے ہنگاموں سے بے خبر اور اپنی دنیا میں مست تھے۔ ایسی ہی ایک ریاست گونڈل تھی یہ بمبئی ریذیڈنسی میں کاٹھیاواڑ کا علاقہ تھا جہاں کے ٹھاکر صاحب، تاج برطانیہ کی سرپرستی میں حکومت کے مزے لوٹ رہے تھے اور برطانیہ سے وفاداری کا پورا پورا ثبوت دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ برطانیہ کی محبت میں اتنے گرفتار ہوئے کہ عوام کو دنیا کے حالات اور سیاسی فہم و شعور سے بالکل بے بہرہ کر کے رکھ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح گونڈل کے عوام سیاسی بغاوت سے لاعلم رہیں گے اور ان کی حکومت کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔

ریاست گونڈل کی اہم فصلیں کپاس، گندم، جوار اور باجرہ تھیں اور یہی اُن کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ لیکن یہاں کی مرچوں نے برصغیر میں بڑی شہرت حاصل کی، ہمارے گھرانے میں بھی یہ مرچیں خوب ذوق و شوق سے کھائی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت مرچوں بھری پلیٹ الگ رکھی ہوتی تا کہ کسی کو کمی محسوس ہو تو اور لے لے۔

ریاست کا دارالحکومت گونڈل نامی شہر تھا۔ لیکن اکثریت دیہاتوں میں رہ رہی تھی اور وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے۔ ایسا ہی ایک گاؤں ''پانیلی'' نام کا تھا جس کی آبادی ایک ہزار سے کچھ کم تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں میرے دادا، پونجا رہا کرتے تھے۔ آباؤ اجداد بھی وہیں پیدا ہوئے۔ میرے دادا جناب پونجا، اپنے گاؤں پانیلی کے اُن چند لوگوں میں شامل تھے جن کا پیشہ زراعت نہیں تھا۔ انہوں نے چند دستی کھڈیاں لگائی ہوئی تھیں اور چند کاریگروں کے ساتھ سوتی کپڑا تیار کرتے تھے۔ اس کپڑے کی فروخت سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ خوشحالی کے ساتھ گزر بسر ہو جاتا۔ اُن کے تین بیٹے تھے، والجی، ناتھو اور جناح۔ ایک بیٹی مان بائی تھی۔

جناح ذرا زیادہ روشن دماغ اور فعال طبیعت کے مالک تھے۔ جلد ہی اُن کو خیال آ گیا کہ پانیلی جیسے پرسکون اور معمولی سے گاؤں میں وہ کیا ترقی کر سکیں گے لہٰذا گونڈل جانا چاہیے جو کہ بڑا

شہر ہے اور جہاں ترقی کے مواقع زیادہ ہیں۔ چنانچہ وہ گونڈل پہنچ گئے۔ ان کے پاس سرمایہ کم تھا لیکن تجارتی سوجھ بوجھ کافی زیادہ تھی۔ وہ جلد باز بھی نہیں تھے اور سوچ سمجھ کر کاروبار میں روپیہ لگانا چاہتے تھے۔ ان کا کاروبار جلد ہی ترقی کے منازل طے کرنے لگا اور ان کے سرمائے میں جلد ہی کافی اضافہ ہو گیا۔

اب دادا نے ان کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش شروع کر دی جو اسماعیلی خوجہ برادری کے خاندان سے ہو۔ رشتے کی تلاش میں انہوں نے پانیلی سے باہر بھی نظر دوڑائی۔ دس میل دور دھفہ نامی گاؤں کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی مٹھی بائی انہیں پسند آ گئی اور رشتہ طے ہو گیا۔ میرے والد اور والدہ مٹھی بائی کی شادی 1874ء میں انجام پائی۔ میرے والد جناح صاحب کا کاروبار پھیلتا گیا اور اپنی محنت اور لگن کے باعث وہ ترقی پر ترقی کرتے چلے گئے۔ اب ان کی نگاہیں بمبئی جیسے بڑے شہر پر لگی ہوئی تھیں جہاں کے بارے میں انہوں نے سن رکھا تھا کہ وہاں بے شمار دولت ہے۔ کراچی کے بارے میں بھی ان کا دھیان گیا جو بمبئی کے مقابلے میں کافی چھوٹا تھا لیکن یہاں بھی آگے بڑھنے کے کافی مواقع تھے۔ ان کے ذہن رسا نے انہیں سمجھایا کہ کراچی زیادہ مناسب رہے گا اور وہاں قدم جمانے میں زیادہ آسانی رہے گی۔ چنانچہ وہ اور میری والدہ کراچی آ گئے۔

کراچی کا ایک علاقہ کھڈہ تھا جہاں بادبانی کشتیوں پر مچھلیوں کا شکار کیا جاتا تھا اور دھوپ میں خشک کر کے محفوظ کر لیا جاتا۔ کھارادر کے مکانات میں بحیرہ عرب کا نمکین پانی گھس جاتا اور گلی کوچوں میں بھی بہتا رہتا۔ میٹھادر میں لیاری اور ملیر ندی سے پانی آتا جو کہ میٹھا ہوتا۔ صدر میں میرے والد نے دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ نیونہم روڈ پر لے لیا۔ یہ شہر کا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں گجرات اور کاٹھیاواڑ کے بھی چند تجارتی خاندان آباد تھے۔ ہمارا فلیٹ پہلی منزل پر تھا۔ لکڑی اور لوہے کی بنی ہوئی ایک کشادہ بالکونی بڑے اچھے رخ پر تھی جہاں سے سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا خوب آیا کرتی۔

میرے والد صاحب نے کئی کاروبار میں ہاتھ ڈالا۔ اُن کے ہاتھوں میں پارس تھا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتے وہ خوب منافع دینے لگتا۔ کراچی کی چند برطانوی فرمیں درآمد و برآمد کا کاروبار کرتی تھیں۔ گراہم ٹریڈنگ کمپنی ایسی ہی ایک اچھی فرم تھی۔ والد صاحب نے اگرچہ انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر فطری ذہانت کے سبب اس زبان پر اچھی خاصی استعداد حاصل

کر لی اور انگریزی میں بول چال پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ اسی صلاحیت کی بناء پر وہ گرامس ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل منیجر کے قریب آ گئے اور اس بات نے انہیں ترقی کرنے میں کافی معاونت کی۔

کچھ عرصہ بعد جب ہم ذرا سمجھدار ہوئے تو والد صاحب ہم تینوں بہنوں کو انگریزی لکھنا پڑھنا سکھانے لگے۔ وہ بڑے سخت گیر انسان تھے اور ہمیں ایسا لگتا تھا گویا کلاس روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر یہ محنت آخر کار رنگ لائی اور ہم نے انگریزی زبان پر اچھی خاصی دسترس حاصل کر لی۔ ان دنوں کابل اور قندھار سے پٹھان تجارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ والد صاحب نے ان سے ربط وضبط بڑھا کر فارسی بھی سیکھ لی اور روانی کے ساتھ ان کے ساتھ بات چیت کیا کرتے۔ کاٹھیاواڑ میں ہمارے یہاں گجراتی زبان بولی جاتی تھی لیکن کراچی میں رہ کر ہم لوگ سندھی اور کچھی زبان بھی سیکھ گئے۔

میرے والد صاحب نے گرامس ٹریڈنگ کمپنی کے ساتھ ساتھ دیگر کمپنیوں سے بھی کاروباری تعلقات بڑھا لیے اور جیلاٹن اور گوند کا کاروبار کرنے لگے۔ انگلستان اور ہانگ کانگ میں کاروبار پھیل گیا۔ ان کے ساتھ انگریزی میں کاروبار ہوتا تھا۔ کھارادر کے چند تاجر بینکاری بھی کرتے تھے۔ پنجاب، بلوچستان اور اندرون سندھ کے تمام معاملات کراچی کی بندرگاہ سے ہی طے پاتے تھے۔ جدید بینکاری کے انتظامات اگرچہ اُن دنوں موجود نہیں تھے لہٰذا رقم کا لین دین ان ہی فرموں کے تعاون سے ہوتا تھا اور کئی تاجر اپنی بچت ان کے دفاتر میں جمع کرا دیا کرتے تھے۔ یہ تاجر بہت ایماندار ہوا کرتے تھے اور ان کی زبان ہی سند ہوا کرتی تھی۔ میرے والد نے اپنی کمپنی کا نام جناح پونجا اینڈ کمپنی کے نام سے قائم کی تھی اور تاجر برادری اُن پر اور ان کی کمپنی پر بھرپور اعتماد رکھتی تھی۔

ہمارے گھرانے میں خوشی کی آمد آمد تھی۔ والد صاحب اپنی بیوی کی دیکھ بھال پر پوری توجہ دے رہے تھے۔ کراچی میں کسی اچھے زچہ خانہ کا کال تھا لیکن چند اچھی دائیاں موجود تھیں اور ان کی بے حد مانگ تھی۔ کھارادر میں ایک دائی رہتی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ شہر کی بہترین دائی ہے۔ اس کے ساتھ معاہدہ طے پا گیا۔ خدا خدا کر کے پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اتوار کا دن اور تاریخ 25، دسمبر 1976ء۔ یہ بچہ بہت کمزور اور لاغر تھا۔ سر لمبا اور پیشانی آگے کی طرف نکلی ہوئی۔ ماں باپ کو اس کی صحت کے بارے میں پریشانی لاحق ہوگئی۔ وزن بھی بہت کم تھا۔ ڈاکٹر سے کہا گیا کہ اس کا مکمل چیک اپ کریں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ جسمانی طور پر صحت مند ہے، بس ذرا کمزور ہے۔

اب بچے کا نام رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوا۔ کاٹھیاواڑ میں ہمارے نام بھی ہندوؤں سے ملتے جلتے ہوا کرتے تھے لیکن اب ہم سندھ میں تھے جہاں مسلمان جیسے ناموں کا رواج تھا۔ طے ہوا کہ پہلے بیٹے کا نام محمد علی رکھا جائے گا۔

والدہ محمد علی سے بے پناہ پیار کرتی تھیں۔ ان کی چھ اولادیں اور بھی ہوئیں لیکن محمد علی سب سے پیارا تھا۔ میری والدہ کے تین بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ رحمت، مریم، احمد علی، شیریں، فاطمہ اور بندے علی۔(ان بچوں کی پیدائش کی تفصیل حسب ذیل ہے:

محمد علی 1876ء، بندے علی 1880ء، احمد علی 1886، رحمت 1878، مریم 1882ء، شیریں 1888ء، فاطمہ 1891ء۔ بندے علی کم عمری میں ہی وفات پا گئے۔

محترمہ شیریں جناح (1980-1888) بتاتی ہیں کہ جناح پونجا (وفات 1902ء) کے چار بیٹے تھے اور چار بیٹیاں۔ آخری بچے کی پیدائش 1893ء میں ہوئی تھی۔ اس کی رسم عقیقہ بھی ادا نہیں کی گئی اور نہ ہی نام رکھا گیا کہ اچانک ہی والد اور والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بعد میں بچے کو "منجو" کا نام دیا گیا۔)

والد صاحب کا کاروبار پھیلتا جا رہا تھا اور ان کی ذمہ داریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ادھر والدہ کا اصرار تھا کہ دونوں میاں بیوی مل کر محمد علی کو درگاہ حسن پیر لے جائیں جو کہ ہمارے گاؤں پانیلی سے دس میل دور تھا، اور وہاں لے جا کر اس کا عقیقہ کریں۔ والدہ بچپن ہی سے اس درگاہ میں مدفون پیر کی کراماتی داستانیں سن چکی تھیں اور ان کے وجدان نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ محمد علی کا مستقبل انتہائی تابناک ہے۔ رسم ورواج کے مطابق محمد علی کے سر کے بال مونڈے گئے اور والدہ نے مقدس پیر کے لیے منت مانی۔ اور دونوں کراچی سے کاٹھیاواڑ کی ویراوال بندرگاہ کی طرف روانہ ہوئے لیکن کشتی طوفان میں پھنس گئی۔ سب لوگ خوف و ہراس سے دیوانے ہو گئے کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ سب لوگ طوفان ٹل جانے کی دعائیں کر رہے تھے۔ والدہ نے محمد علی کو سینے سے چمٹا لیا اور اُس کی سلامتی کے لیے وظیفے پڑھنے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں طوفان تھم گیا اور لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

جب کشتی ویراوال بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئی تو والد اور والدہ نے ایک بیل گاڑی کرائے پر حاصل کی اور بڑی عقیدت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے حسن پیر کی درگاہ پر جا پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ پیر

موصوف اسماعیلی مبلغ کی حیثیت سے بلوچستان آئے۔ کچھ عرصہ ملتان میں قیام کیا جہاں اُن کی درویشانہ زندگی دیکھ کر عقیدت مندوں کا ہجوم ان کا دم بھرنے لگا۔ بعد ازاں وہ سندھ میں داخل ہوئے اور تبلیغ کرتے کرتے پانیلی کے قریب ایک جگہ کو اپنا مستقل مستقر قرار دیا اور یہیں تبلیغ کا فرض انجام دیتے رہے۔ ایک روایت کے مطابق وہ مافوق الفطرت قوتوں کے بھی مالک تھے۔ وہ صبح دو بجے اٹھ کر دریائے بھادبھر کے کنارے فجر کی نماز تک ذکر وفکر میں مصروف رہتے۔ ایک بھیانک رات کو دریا میں طوفان آ گیا۔ وہ ذکر وفکر میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ انہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلا اور ایک تیز لہر انہیں اپنے ساتھ بہا کر دریا کے اندر لے گئی اور اسی طرح ان کی فانی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ تیرتی ہوئی ان کی لاش گنود گاؤں پہنچ گئی۔ یہاں رابارِی ذات کے غیر مسلموں کی اکثریت تھی اور بھیڑ بکریاں اور گائے بھینس وغیرہ پالنا ان کا پیشہ تھا۔

انہوں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ مقدس بزرگ حسن پیر کی لاش ہے کیونکہ اُن کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ان کے عقیدت مند بے شمار تھے۔ انہوں نے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہوئے لاش کو بڑے اہتمام سے دفن کیا اور مقبرہ تعمیر کیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح ان کے گاؤں میں خوشحالی آجائے گی۔

اب اس واقع کو سالہا سال گزر چکے ہیں لیکن گونڈل ریاست کے باشندوں کے دل سے اُن کی عقیدت اُسی طرح برقرار ہے اور ہر سال درگاہ پر عرس ہوتا ہے جس میں ہندو اور مسلم سب شریک ہوتے ہیں۔ رسم عقیقہ کی ادائیگی کے بعد والدین اپنے بیٹے کو لے کر واپس پانیلی آ گئے۔ کراچی میں والد صاحب کے بچپن کے دوستوں اور عزیز و اقارب نے اُن کی کامیابیوں کا چرچا سن رکھا تھا چنانچہ انہوں نے جشن منانے کے لیے ایک تقریب سرانجام دینے کا فیصلہ کیا جس میں پورے گاؤں کو بلایا گیا اور خوب دھوم دھام سے یہ جشن منایا گیا۔ تقریب میں شرکت کے لیے میرے والدین بھی گونڈل سے کراچی آ چکے تھے۔

میرے والد صاحب سادہ طرز زندگی کو پسند کرتے تھے اور روپیہ بڑی احتیاط سے خرچ کرتے تھے کیونکہ ابھی انہیں اپنے کاروبار کو مزید پھیلانا تھا اور اس کے لیے جمع پونجی کی بہت اہمیت تھی۔ ہم نے اسی ماحول میں پرورش پائی اور ہمارے اذہان کا یہی خاصہ رہا۔ اب محمد علی کی عمر چھ سال ہو چکی تھی۔ والدین نے گھر پر گجراتی پڑھانے کے لیے ایک استاد مقرر کر دیا۔ اسکول کافی دور

تھا لہٰذا یہ بہتر سمجھا گیا کہ اسکول میں داخلے سے قبل اُسے بنیادی طور پر کچھ استعداد حاصل کر لینے کا موقع دیا جائے۔ وہ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیل کود کر نو سال کی عمر کو پہنچے تو انہیں اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اب پڑھنے لکھنے کی طرف اُن کی توجہ مبذول ہوگئی اور کھیل کود ختم ہوگیا۔ مگر پھر بھی وہ اسکول کے ممتاز طالب علم نہ بن سکے۔

والد صاحب کا خیال تھا کہ محمد علی کو میٹرک کرانے کے بعد اپنے ساتھ کاروبار میں لگا دیا جائے۔ لیکن والدہ کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا تعلیم کی طرف توجہ دے اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھتا جائے۔ ایک دن والد صاحب نے ان سے پوچھا ''آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''میں آپ کے ساتھ رہ کر کاروبار کے گر سیکھنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ تھوڑا بہت پڑھ لو تو کاروبار کا فن بھی سیکھ لوگے۔''

''میں دفتر میں بیٹھ کر سب کچھ بہت جلد سیکھ لوں گا۔''

والد صاحب چاہتے بھی یہی تھے لہٰذا انہوں نے بیٹے کو ایک اور انداز میں اپنے فیصلے پر ثابت قدم رکھنے کے لیے کہا۔

''میرے دفتر میں نظم و ضبط کی سخت پابندی ہے۔ آٹھ بجے صبح میرے ساتھ دفتر جانا ہوگا۔ دوپہر میں دو سے چار بجے تک کھانے کا وقفہ ہوگا۔ ہم تم گھر آ کر کھائیں گے اور پھر چار بجے سے رات کے نو بجے تک دفتر میں کام کرنا ہوگا۔ بولو تمہیں منظور ہے؟''

''میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ ایک عزم کے ساتھ بولے۔

چنانچہ اب محمد علی نے باقاعدہ طور پر اپنے والد کے ساتھ دفتر جانا شروع کر دیا لیکن انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ یہاں ہر کام لکھائی پڑھائی کا تھا۔ خرچ اور وصولی کی رقموں کو کھاتے میں درج کیا جاتا۔ یہ سب ان کے بس کا نہ تھا۔ وہ صرف چھوٹے موٹے کام ہی کر سکتے تھے۔ دو ماہ کے اندر ہی وہ اُکتا گئے اور والد صاحب سے درخواست کی کہ وہ انہیں دوبارہ اسکول میں داخل کرا دیں۔

والد صاحب اس فیصلے سے خوش ہوئے اور نصیحت کرتے ہوئے کہا، ''اعلیٰ تعلیم حاصل کرو اور بزرگوں کے مشورے پر عمل کرو۔''

انہوں نے چند لمحات توقف کیا اور پھر بولے، ''ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اپنا راستہ خود منتخب

کرواور زندگی کی تلخیوں اور ٹھوکروں سے سبق سیکھو......''

محمد علی کو دوسرا مشورہ پسند آیا۔ دوبارہ اسکول میں داخل ہونے کے بعد وہ بالکل بدل گئے۔ وہ اپنے ضائع کردہ وقت کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی توجہ پڑھائی میں صرف کرنے لگے اور تعلیم کے میدان میں آگے بڑھتے رہنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ والد صاحب اپنے بیٹے کو اس توجہ اور لگن سے پڑھتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ مگر ایک دن استاد نے بتایا کہ وہ حساب میں بہت کمزور ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ محمد علی حساب میں خوب تر ہوجائے تاکہ کاروبار سنبھال سکے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بیٹے کو نیونہم روڈ پر سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کرادیا جائے۔ اس اسکول کی بنیاد خان بہادر حسن علی آفندی نے رکھی تھی ۲؎ (۲؎ حسن علی آفندی (1895 - 1832) سندھ کے قابل فخر مصلح تھے۔ انہوں نے 1885ء میں اس اسکول کی بنیاد ڈالی) اور مسلمانوں کو اس اسکول پر فخر تھا۔ دس سال کی عمر میں محمد علی کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا۔ وہ اس اسکول کے 114 ویں طالب علم تھے۔ یہاں بھی انہیں پڑھائی کی نسبت کھیل کود سے زیادہ رغبت تھی۔

میری پھوپھی جو کہ میرے والد کی اکلوتی بہن تھیں، بمبئی سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ اُن کا نام مان بائی تھا اور اُن کی شادی بمبئی میں ہوئی تھی۔ وہ بڑی زندہ دل اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ذہین بھی بہت تھیں۔ دونوں بھائی بہنوں میں بڑا لگاؤ تھا۔ قائداعظم کی چالیس (40) سالہ رفاقت پر جب میں نظر ڈالتی ہوں تو مجھے دوستی اور خلوص بھرے تمام رشتے یاد آنے لگتے ہیں۔ کئی برس بعد جب مان بائی مع شوہر مستقل سکونت کے لیے کراچی آگئیں تو ہمارے گھر اُن کا آنا جانا برابر ہوا کرتا تھا۔ انہیں کہانیاں سنانے کا بہت شوق تھا۔ یہ سوچ کر مجھے آج بھی شدید حیرت ہوتی ہے کہ اتنی ساری کہانیاں وہ کیسے یاد رکھا کرتی تھیں۔ وہ کبھی اسکول نہیں گئی تھیں اور نہ ہی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ چنانچہ ظاہر ہوا کہ یہ سب کہانیاں سنی سنائی ہوں گی۔ رات کے وقت ہم سب عزیز رشتہ دار ان کے گرد اکھٹے ہوجاتے اور وہ پریوں اور جنوں بھوتوں کی کہانیاں بڑے دلکش پیرائے میں سناتی جاتیں اور ہم بڑے شوق اور دلچسپی سے سنتے رہتے۔

محمد علی اپنی تعلیم کی طرف سنجیدگی سے مائل نہیں ہو رہے تھے۔ چنانچہ میرے والد، والدہ اور پھوپھی نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ محمد علی کو بمبئی بھیج دیا جائے۔ شاید ماحول کی تبدیلی سے اُن پر

خوشگوار اثر آ جائے اور ان کے ذہن میں کوئی اور سوچ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ وہ مان بائی پھوپھی کے ساتھ بمبئی چلے گئے۔ وہاں اُن کو انجمن اسلام اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں محمد علی کا دل لگ گیا اور انہوں نے جلد ہی گجراتی کی چوتھی جماعت پاس کر لی۔ اب وہ انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلے کے مستحق ہو گئے۔ مگر والدہ اپنے پیارے بیٹے کی جدائی برداشت نہ کر سکیں اور محمد علی کو واپس کراچی بلا لیا۔ والد صاحب نے انہیں دوبارہ سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کرا دیا۔ اس بار اُن کا داخلہ نمبر 178 تھا اور تاریخ 1887-12-23۔

اب ان کی دلچسپی کا مرکز گھوڑے بھی ہو گئے تھے۔ میرے والد کے پاس کئی گھوڑے اور گھوڑا گاڑیاں تھیں کہ اُن دنوں یہی سواری شاہانہ اور رئیسانہ تصور کی جاتی تھی۔ موٹر کاروں کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ کھارادر کے ایک تاجر کا بیٹا کریم قاسم ان کا دوست تھا اور دونوں خوب گھوڑا سواری کیا کرتے۔

ایک بار پھر اُن کی ذہنی رو بہکی اور انہوں نے والد صاحب سے فرمائش کی کہ انہیں کسی اور اسکول میں داخل کرا دیا جائے۔ انگریزی کی چوتھی جماعت سے انہوں نے سندھ مدرسۃ الاسلام چھوڑ دیا۔ تاریخ 1891-01-05 اور پھر لارنس روڈ کراچی کے سی۔ ای۔ ایس ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ مگر جلد ہی یہاں سے بھاگ کر دوبارہ سندھ مدرسۃ الاسلام میں چلے گئے اور 1891-02-09 کو سندھ مدرسہ میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت محمد علی کی عمر پندرہ سال ہو چکی تھی اور والد صاحب کو ان کے مستقبل کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

گراہمس ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل منیجر میرے والد کے گہرے اور اچھے دوست تھے۔ انہوں نے پیشکش کی کہ وہ محمد علی کو اپنے صدر دفتر لندن میں تین سال کے لیے زیرِ تربیت رکھوا سکتے ہیں۔ وہاں رہ کر وہ کاروباری نظم و نسق کی عملی تربیت حاصل کر سکتے ہیں اور کچھ کام سیکھ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ والد صاحب کو یہ تجویز پسند آئی۔ انہوں نے کراچی سے لندن کے سفر اور پھر وہاں کے اخراجات وغیرہ کے لیے معلوم کیا اور پھر محمد علی کو لندن بھیج دیا گیا۔ والد صاحب کو یہ اندازہ تو تھا کہ تین سال تک صرف خرچ کرنا پڑے گا لیکن مستقبل انہیں خوش آئند نظر آ رہا تھا۔ اُن کی یہ دور اندیشی کام آ گئی۔ والدہ اب بھی اس کے لیے تیار نہ تھیں کہ وہ تین سال تک کے لیے بیٹے سے جدا ہو جائیں لیکن والد صاحب نے سمجھایا کہ ہمارا اور ہماری فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی کا فائدہ اسی میں

ہے۔ تین سال کا عرصہ جلد گزر جائے گا اور بیٹا بھی کسی قابل بن جائے گا۔ بالآخر والدہ راضی ہوگئیں مگر یہ شرط عائد کردی کہ محمد علی کی شادی کرنے کے بعد اُسے لندن بھیجا جائے ورنہ محمد علی جیسے خوبصورت نوجوان کو کوئی انگریز لڑکی اپنے دام میں پھنسا نہ لے۔

اب رشتے کی تلاش شروع ہوئی۔ پانیلی میں والدہ اسماعیلی خوجہ کے ایک خاندان کو جانتی تھیں۔ اُن کی ایک لڑکی ایمی بائی انہیں پسند آ گئی۔ تاہم لڑکے سے بھی رائے لینا ضروری تھا۔ ان دنوں لڑکا اور لڑکی دونوں کے رشتے والدین اور بزرگ طے کرتے تھے اور کسی کو چوں کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ محمد علی اپنی والدہ سے بہت پیار کرتے تھے چنانچہ اُن کی خوشی پر وہ بھی خوش ہوگئے اور جلد ہی منگنی کی رسم ادا کردی گئی اور اس کے بعد شادی۔ پانیلی روانہ ہونے سے قبل 30-01-1892 کو انہوں نے سندھ مدرسہ چھوڑ دیا۔ اُس وقت وہ انگریزی کی پانچویں جماعت میں تھے۔

میرے تمام عزیز و اقارب، والد، والدہ محمد علی، کراچی سے ویراوال روانہ ہوئے جس کے لیے سمندری راستہ اختیار کیا گیا۔ ویراوال سے بیل گاڑیوں پر بارات پانیلی کو چلی۔ پانیلی کے سادہ لوح اور معصوم عوام کے دل میں یہ بات جڑ پکڑ چکی تھی کہ اُن کے گاؤں کا ایک عام آدمی جس کو وہ جناح بھائی کہتے تھے کراچی جا کر کروڑ پتی بن گیا ہے اور بہت بڑا تاجر ہے۔ اُس پر انہیں بے حد فخر تھا۔ والدین بھی اپنے گاؤں والوں کی امیدوں کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے لہٰذا وہ ان کے لیے بہت سے تحفے تحائف لے کر آئے تھے۔ لیکن پھر بھی تحائف کم پڑ گئے۔ والد صاحب نے مزید اشیاء کی خریداری کے لیے اپنے رشتہ کے بھائیوں کو گونڈل بھیجا۔ ساتھ ہی آتشبازی کا بھی خوب سارا سامان منگوایا۔ ان دنوں بینڈ باجوں کا رواج نہیں تھا چنانچہ گونڈل سے نقارچی بلوائے گئے۔ ان سب نے مل کر وہ ہنگامہ مچایا کہ دور دور تک کا علاقہ آتشبازی اور دیگر تماشوں سے گونج اٹھا۔

خواتین مستقل خریداری میں مصروف رہیں۔ بے شمار کپڑے، زیورات خریدے گئے او رمٹھائیوں کے ٹوکرے دلہن کے گھر لے جانے کی تیاریاں کرتی رہیں۔ رسم و رواج کے مطابق گیت وغیرہ گاتی ہوئی خواتین کا جلوس دلہن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ آگے آگے نقارچی تھے۔ راستے بھر چاول اور دیگر اناج لٹائے گئے۔ ایک ہفتہ تک کھانے پینے کا شغل جاری رہا۔ پانیلی گاؤں کی رونقیں دوبالا ہوتی رہیں بلکہ گونڈل کے آس پاس کے دیہات دلہن کے روپ میں ڈھل

گئے۔ والد صاحب نے دولت پانی کی طرح بہایا کیونکہ اُن کے بیٹے کی شادی تھی۔ دھوم دھام اور شان و شوکت سے یہ شادی رچائی گئی۔ پانیلی والے یہ تقریب ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

شادی کے وقت دولہا کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ وہ بڑے شرمیلے اور کم سخن واقع ہوئے تھے۔ اپنی بہنوں اور دیگر قریبی عزیز لڑکیوں کے علاوہ انہوں نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ اپنی دلہن کے ساتھ کیسے بات کریں گے جس کو انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر ان کے اندر خود اعتمادی تھی اور وہ جانتے تھے کہ وہ ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ گاؤں کے مولوی صاحب نے چند آیات تلاوت کر کے سولہ سالہ محمد علی اور چودہ سالہ ایمی بائی کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

والد صاحب کو کراچی سے آئے ہوئے پورا ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ کاروبار کس سمت جا رہا ہے کیونکہ مواصلات کا نظام دگرگوں تھا۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب فوراً کراچی واپس چلنا چاہیے۔ لیکن خاندان اور گاؤں کے اپنے رسم رواج ہوتے ہیں جنہیں توڑنا اور ان سے روگردانی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بھائی کے سسرال والے بھی انہی روایات میں بندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ تین ماہ آپ کو رکنا ہوگا۔ کافی رعایت کر کے انہوں نے ایک ماہ مزید رکھنے کا وقت دیا۔ اس کے بعد ہی وہ دلہن کو کراچی بھیجیں گے۔ والد صاحب مزید رکنے کو تیار نہیں تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ دلہن کو چھوڑ کر چل دیں۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ محمد علی یہاں رک جائیں اور بعد میں اپنی دلہن کو لے کر چلے جائیں۔ مگر محمد علی اس بات پر بھی تیار نہ تھے۔ وہ اپنے والدین کے ہمراہ واپس جانا چاہتے تھے۔

اس مسئلے پر اب دونوں گھرانوں میں گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ بات چیت چلتی رہی مگر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ بالآخر اس معاملے کو محمد علی نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ماں باپ کو بتائے بغیر سسرال پہنچ گئے۔ دیگر تکلفات اور آؤ بھگت کی رسمیں جب پوری ہو گئیں تو انہوں نے پر اعتماد لہجے میں اپنا مدعا بیان کیا، ”میرے والدین پانیلی میں مزید نہیں رک سکتے اور میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ دلہن بھی میرے ہمراہ جائے گی۔ لیکن اگر آپ اس کی اجازت نہیں دیں گے تو وہ بے شک یہاں رہے اور بعد میں جب آپ کی مرضی ہو، اُسے کراچی بھیج دیں۔“

سسرال والے کم عمر اور کم سن داماد کی کھری کھری باتیں سن کر پریشان ہو گئے۔ محمد علی نے

مزید کہا کہ وہ جلد ہی تین سال کے لیے لندن جا رہے ہیں۔ اگر دلہن کو بھیجنے میں دیر کی گئی تو اُسے تین سال تک مزید انتظار کرنا پڑے گا۔

ان کے اس ٹھوس اقدام نے سسرال والوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔ اختلافات دور ہو گئے۔ دوسرے دن جب محمد علی اپنے ماں باپ کے ہمراہ جواب لینے آئے تو دلہن کے گھر والے ان کے آگے بچھ گئے اور خوشامدانہ انداز میں کہنے لگے کہ دلہن آپ کی بہو ہے۔ آپ جب چاہیں اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔

خاندانی رسم و رواج کے مطابق ایمی بائی جب اپنے سسر کے سامنے آتیں تو چہرے پر بڑا سا گھونگھٹ نکال لیتیں۔ یہ بات بزرگوں کے احترام کی علامت تھی۔ لیکن محمد علی ان باتوں کو دقیانوسی خیال کرتے تھے۔ اب اُن کی بیوی، ماں باپ کے سامنے بیٹی کی حیثیت رکھتی تھی اور گھر کی ایک فرد تھی لہٰذا اُس کا غیر ضروری پردہ اب مناسب نہ تھا۔ چنانچہ اپنے شوہر کی خواہش کی تکمیل کرتے ہوئے ایمی بائی نے یہ طرز متروک کر دیا۔

ہم لوگ چند ہی روز بعد دلہن کو لے کر کراچی آ گئے۔ والدہ اس تصور سے ہی پریشان تھیں کہ بیٹے سے تین سال تک کے لیے جدا ہونا پڑے گا۔ مگر محمد علی کے مستقبل کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر راضی ہو گئیں۔ بالآخر محمد علی کی روانگی کا دن آ گیا۔ انہوں نے بیٹے کو گلے لگاتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا، ''میرے بیٹے! اگرچہ میں نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے جدا ہو جاؤ مگر مجبوری ہے۔ انگلستان جا کر تم اپنے فرائض سے غفلت نہ برتنا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ مگر ہو سکتا ہے کہ تمہاری واپسی تک میری زندگی ساتھ نہ دے سکے۔''

ایک تاجر وکیل بن گیا:

سمندری قوی ہیکل جہاز اپنی منزل لندن کی طرف رواں تھا! (نومبر 1892ء۔ دوسرا اندازہ ہے کہ 1893ء میں وہ انگلستان روانہ ہوئے۔) میرا بھائی اپنی نئی زندگی حاصل کرنے کے لیے ایک ایسی جگہ جا رہا تھا جو اُس کے لیے اجنبی سرزمین تھی۔ جہاز میں وہ سب سے کم عمر نوجوان تھا (بچوں کے علاوہ) 1890ء وہ زمانہ تھا جب انگلستان کا بحری سفر ایک ہندوستانی کے

لیے خواب سمجھا جاتا تھا اور ایسے کٹھن مرحلے میں سولہ سالہ لڑکے کے ساتھ نہ کوئی محافظ تھا اور نہ کوئی ساتھی۔ جہاز میں زیادہ تر مسافر انگریز تھے۔ ایک انگریز کو یہ نوجوان بھا گیا اور وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔ انگریز نے پوچھا کہ اس کے سفر کا مقصد کیا ہے کیا وہ وہاں کسی کو جانتا ہے، کہاں قیام ہوگا اور آگے کیا ارادے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ بھائی اپنی استعداد کے مطابق جواب دیتا رہا۔ وہ انگریز انہیں لندن کے بارے میں مفید باتیں بتلاتا رہا۔

جہاز کو بمبئی سے لندن پہنچنے میں تین ہفتے کا وقت درکار ہوتا تھا۔ راستے میں ایک بندرگاہ پر جہاز دو تین گھنٹوں کے لیے رکتا تھا۔ یہ بندرگاہ پورٹ سعید (مصر) کی تھی۔ یہاں مسافر اتر کر سیر و تفریح کرتے اور کچھ خریداری بھی کرتے۔ اس انگریز نے اپنے نوجوان دوست کو مشورہ دیا کہ یہاں ہر دم اپنی جیب سے ہوشیار رہیں کیونکہ یہاں گرہ کٹ اور جیب کترے بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بٹوے کی زبردست حفاظت کی۔ پورٹ سعید کے شہر میں بھی گھوم پھر آئے اور آ کر انگریز کو بڑے فخر سے بتایا کہ ان کا مال محفوظ ہے۔ انگریز نے انہیں شاباشی دی۔ مارسیلز کی بندرگاہ پر وہ انگریز اتر گیا۔ اُس نے اپنا لندن کا پتہ میرے بھائی کو دیا اور کہا کہ کبھی کبھی ملاقات کرنے آجایا کرو۔ چنانچہ اگلے چار برس جب تک وہ وہاں رہے، اُس انگریز کے ساتھ میل جول قائم رکھا۔

ساؤتھیمپٹن میں محمد علی کو جہاز سے اتار دیا گیا کہ یہاں سے لندن جانے کے لیے ٹرین کا سفر اختیار کریں۔ لندن پہنچ کر انہوں نے ایک گھوڑا گاڑی کرایے پر لی اور اُسی گاڑی کے سائیس کے مشورے پر ایک مناسب ہوٹل پہنچ گئے۔ جلد ہی اُن کا سامان ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

والد صاحب نے محمد علی کو دو تعارفی خطوط دیئے تھے۔ اتفاق سے وہ دونوں اس وقت لندن میں موجود نہیں تھے چنانچہ اُن سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لندن کا موسم بے حد سرد اور سخت تھا۔ ہوٹل سے دفتر تک جانے کے لیے کرائے کی گھوڑا گاڑی لینا ان کے بس سے باہر تھا، لہٰذا انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ پیدل یہ سفر طے کیا جائے۔ کئی سال بعد انہوں نے مجھ سے یہ ذکر کیا:

''اس نئے ملک میں، میں بالکل تن و تنہا تھا۔ یہاں کی زندگی بھی بالکل مختلف تھی۔ جس دفتر میں میں کام کرتا تھا، وہاں بھی اپنے ساتھیوں سے میری کوئی خاص جان پہچان نہیں تھی۔ لندن کی سردیوں اور موسلا دھار لگاتار بارشوں نے میرے حوصلے پست کر دیے تھے۔ میرا پورا جسم درد کی شدت سے اکڑ

جایا کرتا۔لیکن پھر میں ان سختیوں کا عادی ہو گیا اور میرے جسم میں پھرتی اور تازگی بھرنے لگی۔"

گرامس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر واقع تھریڈ ینڈل روڈ میں محمد علی کو ایک میز اور کرسی فراہم کردی گئی جہاں وہ دیگر ملازمین کے ساتھ بیٹھ کر کاروباری داؤ پیچ اور نظم ونسق سیکھتے اور کام کرتے۔وہ جب آئے تھے تو ان کے پاس بہت تھوڑی رقم تھی۔والد صاحب نے کچھ اور رقم بینک آف اسکاٹ لینڈ۲ (۲ یکم فروری 1893ء کو بینک میں اکاؤنٹ کھولا گیا۔) کے ذریعہ ان کو بھجوادی تاکہ انہیں کوئی تنگی ترشی نہ ہو۔

جلد ہی انہوں نے محسوس کرلیا کہ ہوٹل میں زیادہ دیر تک قیام انہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ایک خیر خواہ نے مشورہ دیا کہ وہ کوئی ایسا خاندان تلاش کریں جو انہیں بطور پینگ گیسٹ قبول کرلے۔ اس طرح اُن کے اخراجات میں کافی کمی ہوجائے گی۔انہوں نے اخبارات کے ذریعے چند ایسے پتے نوٹ کیے اور مسز ایف۔ای۔پیج ڈریک کے یہاں جا پہنچے،جن کا گھر 35،رسل روڈ پر واقع تھا۔یہ علاقہ لندن کا ایک اچھا رہائشی علاقہ ہے۔چند سال قبل لندن کاؤنٹی کونسل نے اس عمارت پر ایک یادگاری تختی نصب کردی ہے،جس پر یہ عبارت تحریر ہے:

"قائداعظم محمد علی جناح (1948 - 1876) بانی پاکستان نے 1895ء میں یہاں قیام کیا۔"

لندن میں رہ کر اب ان کا ذہن یہاں کے ماحول کا گہرا اثر قبول کرتا جارہا تھا اور وہ آزاد خیالی کی جانب متوجہ ہوتے جارہے تھے۔صبح صبح ناشتے کے وقت وہ کئی اخبارات کا مطالعہ کرلیتے۔ خاص طور پر انگلستان کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں کی تقریروں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے اور ان پر غور کرتے۔دن بھر دفتر کے کاموں میں الجھے رہتے اور جب فرصت ملتی تو اُن کے خیالات اپنے ملک کے سیاسی حالات کی جانب دوڑنے لگتے اور وہ سوچنے لگ جاتے کہ کیا وہ بھی کبھی اپنے ہم وطنوں کی خدمت کرسکیں گے۔اُن کا ذہن بھٹکتا رہا اور پھر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سیاست دان بننے کے لیے قانون کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔

اب وہ ایک مشکل میں گرفتار ہوگئے۔وہ اس شش وپنج میں الجھ گئے کہ کیا گرامس کمپنی میں ان کا مستقبل روشن ہے یا انہیں بیرسٹری کی تیاری کرنی چاہیے؟ بالآخر انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وکالت کے امتحان کی تیاری کریں گے۳ (۳ اس زمانے میں بار کے داخلے کے لیے ایک ابتدائی

امتحان پاس کرنا ضروری ہوتا تھا، یہ امتحان لٹل گو کہلاتا تھا۔) انہوں نے گرامس کمپنی میں اپنی اپرنٹس شپ ختم کردی اور وکالت کا امتحان پاس کرنے کے لیے لگن اور محنت سے کام شروع کردیا۔

یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے ان کی زندگی کا راستہ یکسر تبدیل کردیا۔ان کے دل میں عوام کی خدمت کا جذبہ موجزن ہو چکا تھا اور اس کے لیے انہوں نے اپنی تمام توانائی وقف کردی۔ان کی محنت رنگ لائی اور انہوں نے لٹل گو کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کرلیا[۴] (۴لٹل گو کے امتحان کے قواعد کے مطابق لاطینی زبان کا بھی ایک پرچہ تھا لیکن قائداعظم نے اس شرط سے استثنیٰ حاصل کرلیا۔ 25، مئی 1893ء کو آپ کی کامیابی کا اعلان ہوا۔) اس کے بعد لنکن ان[۵] (۵لنکن ان میں 5، جون 1893ء کو داخلہ لیا۔) میں داخلہ ہوگیا۔انہوں نے لنکن ان کا انتخاب کیوں کیا، یہ بات انہوں نے کافی دنوں بعد بتائی:

''جب میں لٹل گو کے امتحان کی تیاری کررہا تھا تو ان دنوں میں نے لندن کے مختلف اداروں کو دیکھنا شروع کیا اور مختلف طلبہ سے بھی تبادلۂ خیال کیا کہ کون سی جگہ بہتر رہے گی۔لیکن اتفاقاً ایک دن میں لنکن ان کے طرف سے گزرا تو اس کے صدر دروازے پر پیغمبر اسلام کا نام دنیا کے عظیم قانون دانوں میں درج دیکھ کر حیران رہ گیا۔اُسی وقت میں نے عہد کرلیا کہ لٹل گو کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد صرف اور صرف لنکن ان میں ہی داخلہ لوں گا۔''

1892-1896 کے زمانے کی بینک پاس بک آج بھی میرے پاس موجود ہے جس پر ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ''محمد علی جناح بھائی'' درج ہے۔رائل بینک آف اسکاٹ لینڈ کی پاس بک میں جو اندراج ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے 7، جون 1893ء کو داخلہ فیس کے طور پر لنکن ان کو 138.19 پونڈ کا چیک دیا تھا۔گویا سترہ سال کی عمر میں وہ وکالت کی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ادھر کراچی میں والد صاحب اس تصور میں مگن تھے کہ ان کا بیٹا اپنی اپرنٹس شپ مکمل کرکے واپس آئے اور کاروبار میں اُن کی مدد کرے گا۔لیکن جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ وہ وکالت کی تعلیم حاصل کرنے لگ گئے ہیں اور اس کو مکمل کرنے میں تین سال لگیں گے تو انہوں نے فوراً ایک سخت خط لکھا اور کہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر فوراً واپس آجائیں۔

جواب میں محمد علی نے ایک خوشامدانہ خط لکھا اور یہ التماس کی کہ انہیں بار کی تعلیم مکمل کر لینے دیں

اور وہ مزید رقم کا مطالبہ نہیں کریں گے بلکہ لندن میں ہی کچھ کام کر کے اپنے اخراجات پورے کریں گے۔ والد صاحب اگرچہ بیٹے کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے مگر چاروناچار اجازت دے دی۔

ابھی انگلستان میں ان کے قیام کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کی اہلیہ ایمی بائی کا کسی بیماری کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ انہیں زیادہ صدمہ اس لیے نہیں ہوا کہ انہوں نے بہت کم وقت ان کے ساتھ گزارا تھا اور یہ شادی بھی والدین نے اُن کی مرضی کے خلاف کروائی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد جب والدہ کے انتقال کے خبر ملی تو کئی دنوں تک آہیں بھرتے رہے، جس کا اثر ان کی صحت پر پڑا۔ مگر انہوں نے اپنی والدہ کے اس قول کو یاد رکھا کہ میرا بیٹا ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا۔ اب انہیں اس قول کو سچ کر دکھانا تھا۔

والدہ کے انتقال کے بعد ہی والد صاحب کو اپنے کاروبار میں نقصان ہونے لگا۔ انہیں اپنے دوسرے بچوں کی بھی دیکھ بھال کرنی تھی۔ ایسی صورت میں انہیں محمد علی بہت یاد آئے جو ان کا سہارا بن سکتے تھے۔ والد صاحب نے اپنے بیٹے محمد علی کو بتائے بغیر اُن کے نام سے ایک الگ کمپنی قائم کر دی تھی اور یہ کمپنی بھی اب خسارے میں جا رہی تھی۔ انہوں نے محمد علی کو کئی بار تاکید کی کہ اب وہ چلے آئیں اور کاروبار سنبھالیں، مگر انہوں نے ہر بار یہی جواب دیا کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئیں گے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں ہی محمد علی اپنی والدہ اور اہلیہ سے محروم ہو چکے تھے۔ ایسے نازک لمحات میں وہ اور بھی کبیدہ خاطر ہوئے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ کاروبار کی ناؤ بھی طوفان میں گھری ہوئی ہے۔ یہ ایسا نازک لمحہ ہوتا ہے جب بڑے بڑے بہادر جی چھوڑ دیتے ہیں لیکن ایسے ہی مواقع پر بعض افراد کی خفیہ صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ محمد علی نے زینو٦ (٦ زینو۔ فلسفہ میں رواتیت کا بانی۔) کے ایک پیروکار کی حیثیت سے ان مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور یہ عزم کیا کہ وہ اپنے خاندان کا نام روشن کریں گے۔ اسی دم انہوں نے اپنا نام بدل کر ایم۔ اے۔ جناح رکھ لیا۔

وہ ہر ماہ مسز ایف۔ ای۔ پیج ڈریک کو دس پونڈ بطور کرایہ اور طعام ادا کرتے تھے۔ اس کا پتہ ان کے بینک کی پاس بک سے چلتا ہے۔ مسز ڈریک ایک مشفق اور مہربان خاتون تھیں اور وہ محمد علی کو بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ ان کی ایک حسین اور نوجوان بیٹی بھی تھی جو محمد علی کا دل جیتنے کی کوشش کیا کرتی۔ لیکن انہوں نے اس کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ یہ بات انہوں نے خود ہی مجھے بتائی۔

دوران تعلیم محمد علی کی دلچسپیوں کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا لیکن ان کا اصل مطمح نظر تعلیم تھا۔ انہوں نے کوشش کر کے برٹش میوزیم لائبریری کا ٹکٹ حاصل کر لیا ے(ے یہ ٹکٹ فروری 1895ء میں حاصل کیا۔ ٹکٹ نمبر A-53227۔) اتوار کی صبح کبھی کبھار وہ ہائیڈ پارک چلے جاتے اور مختلف مقرروں کی تقریریں سنا کرتے۔ یہاں آزادی اظہار کی کھلی چھوٹ تھی اور اکثر مقرر اپنی ہی حکومت پر تنقید کیا کرتے۔ وہ دارالعوام میں بھی باقاعدگی سے جاتے اور گلیڈ اسٹون ۸(۸ (1809 - 1898) برطانوی مدبر، قانون دان، سیاست داں، لبرل پارٹی کا رہنما، برطانیہ کا وزیر اعظم بھی بنا۔) لارڈ مورلے ۹(۹ جان مورلے (1838 - 1923) لبرل رہنما، برطانوی پارلیمنٹ کا رکن) جوزف چیمبر لین ۱۰(۱۰ (1836 - 1914) برطانوی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن۔) بالفور ۱۱(۱۱ (1848 - 1930) برطانوی سیاست داں، قائد ایوان او رقائد حزب اختلاف بھی رہے۔) اور آئرش لیڈر ٹی۔ پی۔ اوکانر ۱۲(۱۲ (1848 - 1929) آئرش صحافی، برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔) کی تقریریں بڑے شوق سے سنتے۔

دارالعوام میں آمدورفت کی وجہ سے ان کے اندر پارلیمانی فصاحت و بلاغت سمجھنے کا ادراک پیدا ہو گیا جس نے ان کی آئندہ زندگی میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے لنکن ان کا امتحان دو ہی برس میں مکمل کر لیا جس کے لیے انہیں سخت محنت کرنی پڑی ۱۳(۱۳ لنکن ان کے امتحانات 4-2 اپریل 1899ء کو منعقد ہوئے اور نتیجہ 23 اپریل 1895ء کو آیا۔ محمد علی کا نام کامیاب طلبہ میں شامل تھا۔) اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کم عمر ترین طالب علم تھے جو بیرسٹر بن گئے تھے۔ مزید کامیابی یعنی ہیٹ اور گاؤن حاصل کرنے کے لیے انہیں ابھی لندن میں کچھ عرصہ اور قیام کرنا تھا اور مخصوص تعداد میں عشائیوں کی رسم بھی پوری کرنی تھی۔

لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ کی سرگرمیوں کی وہ پوری خبر رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی تعلیم پر بھی توجہ دیتے اور سخت محنت کرتے۔ بمبئی کے ایک تجربہ کار پارسی لیڈر ۱۴(۱۴ دادا بھائی نوروجی (1825 - 1917) ہندوستان کی جانی مانی سیاسی شخصیت۔ تین بار کانگریس کے صدر رہے۔ 1892ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔) دادا بھائی نوروجی برسوں سے لندن میں آباد تھے اور سینٹرل فنس بری کے حلقہ انتخاب سے دارالعوام کا الیکشن لڑ رہے تھے۔ ہندوستانی

طلبہ میں بہت جوش وخروش پھیلا ہوا تھا۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو انتخاب میں حصہ لے رہے تھے لہٰذا فطری طور پر ہندوستانی طلبہ کی پوری دلچسپی ان کے ساتھ تھی۔ محمد علی بھی اپنے آپ کو اس مہم سے الگ نہ رکھ سکے اور خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چنانچہ وہ دادا بھائی نوروجی کی نظروں میں آ گئے۔

بھائی بتا رہے تھے کہ لارڈ سالسبری نے ایک تقریر میں دادا بھائی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ عوام دادا بھائی کو ہرگز منتخب نہ کریں کیونکہ وہ اس قابل نہیں ہے اور اس کا تعلق سیاہ فام نسل سے ہے۔ مجھے اس بات سے سخت تکلیف پہنچی۔ اگر گوروں اور ایسے کم ظرف سیاستدانوں کی یہ سوچ تھی تو ان سے انصاف کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا میں نے مزید جوش وخروش اور شدومد کے ساتھ دادا بھائی کا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تین ووٹ سے جیت گئے۔ یہ جیت بہت کم اکثریت کے ساتھ ہوئی تھی لیکن ہم خوش تھے کہ ہم نے ایک عفریت کو شکست دے دی ہے۔ ہندوستانی طلبہ میں بے حد جوش و خروش پایا جا رہا تھا۔ دادا بھائی نے جب دار العوام میں اپنی تقریر کی تو ہماری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ہم آزادی اظہار کا حق چاہتے ہیں اور اس حق کو استعمال کرتے ہوئے ہم وطنوں کے لیے انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ آگے چل کر محمد علی پر دادا بھائی کی شخصیت کے گہرے اثرات پڑے اور وہ ہمیشہ اُن کا احترام کرتے رہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے ابتدائی دنوں میں دونوں نے مل جل کر کافی اہم خدمات انجام دیں۔

محمد علی انتہائی زیرک اور ذود فہم دماغ رکھتے تھے۔ قیام انگلستان کے دوران انہوں نے یہ بات جلد ہی محسوس کر لی کہ ہندوستانی طلبہ میں رابطوں کی کمی ہے اور وہ ایک دوسرے سے دور دور رہتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی کمزوری تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ منظم نہیں ہو سکتے تھے اور جب تک متحد و منظم ہو کر کام نہ کیا جائے، کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ تمام ہندوستانی طلبہ کی ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے۔ یہ تصور لے کر انہوں نے طلبہ سے رابطے قائم کیے۔ لیکن ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری اس میدان میں انہیں آگے بڑھنے سے روکتی رہی۔ چند گھاگ قسم کے لوگوں نے مخالفت بھی کی۔ انہیں ڈر تھا کہ اس طرح یہ نوجوان لونڈا ہم پر بازی لے جائے گا اور ہماری لیڈری خطرے میں پڑ جائے گی۔

لیکن یہ خیال محمد علی کے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ 1913ء میں ایک ممتاز ہندوستانی رہنما کی

حیثیت سے انہوں نے انگلستان کا دورہ کیا۔ لندن کے کیکسٹن ہال میں اجلاس کا بندوبست کیا گیا جس میں محمد علی نے طلبہ کے اجتماع سے خطاب کیا ۱۵(۱۵۔ 28، جون 1913ء) اور انہیں مشورہ دیا کہ ہندوستان اور انگلینڈ کے سیاسی حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور ان کا جائزہ لیں لیکن تعلیم کے دوران سیاست سے پرہیز کریں۔ آخر میں سینٹرل ایسوسی ایشن آف انڈین اسٹوڈنٹس کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

انگریز ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کر کے محمد علی نے کافی علم حاصل کیا۔ وہ شیکسپئر ۱۶ (۱۶۔ ولیم شیکسپئر (1616-1564) عظیم ترین مصنف اور ڈرامہ نگار۔ وہ ایک عمدہ شاعر بھی تھا۔ اس کے ڈراموں میں انسانی فطرت کے ہر پہلو پر بات کی گئی ہے اور ہر کردار کو اُس نے بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔) سے حد درجہ متاثر تھے اور آخر عمر تک اس کی کتابیں پڑھتے رہے۔ اُن کا بجٹ محدود تھا لیکن پھر بھی شیکسپئر کا ڈرامہ دیکھنے کے لیے وقت اور رقم نکال لیتے۔ ان ڈرامو ں سے دلچسپی لیتے لیتے وہ خود بھی اسٹیج پر اداکاری کے بارے میں سوچنے لگے لیکن انہیں صرف ایک معمولی کردار کی پیشکش ہوئی لہٰذا انہوں نے انکار کر دیا۔ لندن سے واپس آنے کے بعد بھی وہ شیکسپئر کے ڈراموں میں ہی کھوئے رہتے اور وقت نکال کر انہیں پڑھتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ کسی ڈرامے کے پسندیدہ مکالمے اور ابواب بآواز بلند مجھے سنایا کرتے۔ ایسا کرتے ہوئے اُن کی آواز میں لوچ گھن گرج اور زیر و بم پیدا ہو جاتا گویا کہ کوئی بلند پایہ صداکار اپنے فن کا جادو جگا رہا ہے۔

قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کاروبار کے میدان میں گھوڑے دوڑانا ان کے بس کا نہیں، گویا کہ انہیں اس طرف رغبت نہیں محسوس ہوئی۔ وہ صرف دولت کے پیچھے بھاگنے والے انسان نہیں تھے۔ وہ شہرت و عظمت اور وطن کی خدمت کی راہ پر چلنا چاہتے تھے اور قدرت اُن کی اس جانب رہنمائی کر رہی تھی۔

لنکن ان میں تمام کاروائی پوری ہو گئی ۱۷(۱۷۔ 29، اپریل 1896ء کو انہیں بار ایٹ لاء کی ڈگری ملی۔) اور اب ان کو کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا۔ رائل بینک آف اسکاٹ لینڈ کی پاس بک کے چار چیک جو انہوں نے جاری کیے، ان کی تفصیل یہ ہے کہ ایک چیک 14، جولائی 1896ء کو مسز ایف۔ ای۔ پیج ڈریک کے نام تین پونڈ کا تھا۔ 15، جولائی کو تین چیک کاٹے گئے۔ ایک کی

مالیت 10-1-71 پونڈ نیشنل بینک آف انڈیا بمبئی کے نام تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کراچی کے بجائے بمبئی میں رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ دوسرا چیک 12-18--42 پونڈ کا تھا مس کک اینڈ سنز کے نام تھا جو لندن سے کراچی کے کرائے کی ادائیگی کے لیے تھا اور تیسرا چیک بنک کا کھاتہ بند کرنے کے لیے 8-9-10 پونڈ کا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سال تک لندن میں قیام کے دوران انہوں نے آٹھ سو پونڈ بینک میں جمع کرائے اور اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہی اُن کی کل رقم تھی۔

اب وہ ایک ایسے جہاز میں گھر واپس آرہے تھے جو تین ہفتوں میں پہنچتا تھا۔ جیسے ہی ان کا جہاز کراچی کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو ان کی نگاہیں اپنے خاندان والوں کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومنے لگیں۔ انہیں یہ قلق بھی تھا کہ اب وہ اپنی والدہ کو نہ دیکھ پائیں گے۔ تقدیر بھی کبھی کبھار کتنی سفاک ہو جاتی ہے۔ آج والدہ حیات ہوتیں تو اپنے مایہ ناز بیٹے پر کتنا فخر کرتیں۔

گھر میں آنے کے بعد والد صاحب نے انہیں بتایا کہ کاروبار میں کافی نقصان ہوا ہے اور بہت سارا قرضہ بھی چڑھ گیا ہے۔ بعض اداروں نے مقدمات بھی قائم کر دیے ہیں۔ محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے نام سے جو کاروبار جاری تھا وہ بھی متزلزل ہو رہا تھا۔ والد صاحب اس امید پر اُس کمپنی کو چلا رہے تھے کہ میرا بیٹا جب واپس آئے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ مایوس کن صورت حالات دیکھ کر محمد علی بھی فکر مند ہو گئے۔ اور تب والد صاحب نے اُن کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا: ''میرے بیٹے! مجھے اندازہ ہے کہ یہ سب دیکھ کر تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم محنت اور لگن سے کام سنبھالو۔ انشاء اللہ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میری صحت اب ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ نہ جانے کب بلاوا آجائے۔ ایسی صورت میں تمہیں ہی اس طوفان کا مقابلہ کرنا ہے۔''

اب بیٹے کا فرض تھا کہ باپ کی دل جوئی کرے۔ انہوں نے ٹھہرے ٹھہرے پرسکون لہجے میں کہنا شروع کیا: ''ابا جان! اس قدر مایوسی کی ضرورت نہیں۔ سب سے پہلے تو آپ اپنے علاج پر توجہ دیں، میں کل ہی آپ کو نامی گرامی ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔ میں پوری لگن اور دھیان کے ساتھ کاروبار سنبھالوں گا اور جلد ہی تمام قرضے اتر جائیں گے۔ بس آپ میری رہنمائی اور

حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔"

لیکن محمد علی وکالت کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ چنانچہ والد صاحب نے بہتر یہی سمجھا کہ کاروبار کے ساتھ ساتھ وہ اپنا پیشہ بھی جاری رکھیں۔ وہ انہیں ہر چند رائے روشن داس اینڈ کمپنی اور لال چند اینڈ کمپنی میں لے گئے۔ یہ دونوں کمپنیاں اُن کی قانونی مشیر بھی تھیں۔ دونوں فرمیں انہیں اپنے پاس رکھنے کو فوراً تیار ہوگئیں کیونکہ صوبہ سندھ میں ان دنوں مسلمان وکیل بہت ہی کم تھے جبکہ یہ مسلم اکثریتی صوبہ تھا۔ انہیں یقین تھا کہ محمد علی ان کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہوگا۔

لیکن بھائی صاحب کا ارادہ کچھ اور تھا۔ وہ وکالت کی دنیا میں اپنے قدم جمانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ والد صاحب کی شدید خواہش تھی کہ ان کا بیٹا کراچی میں ہی رہے اور یہیں وکالت کرے۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے دوستوں سے بھی مدد لی اور اُن کے ذریعہ محمد علی کو پیغام دیا کہ کراچی میں وہ ان کی پوری مدد کریں گے۔ مگر وہ اپنے فیصلے پر قائم رہے اور بمبئی جا کر ہی دم لیا۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ اُن کا یہ فیصلہ ان کی زندگی کا اہم ترین سنگ میل ثابت ہوگا۔

بمبئی پہنچ کر انہوں نے اپالو ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر ۱۸ لیا (۱۸۔ اپالو ہوٹل کا کمرہ نمبر 10 ان کے پاس تھا۔) اور بمبئی ہائی کورٹ میں اپنا نام بھی رجسٹر کروالیا ۱۹ (۱۹۔ بمبئی ہائی کورٹ میں 24، اگست 1896ء کو اندراج کرایا۔) یہ سب کام آسانی سے ہوگیا۔ اب ضرورت تھی کہ وہ اپنا ایک دفتر بنائیں، مقدمات حاصل کریں اور بحیثیت وکیل اپنی شناخت کرائیں۔ یہ مرحلہ بڑی جان جوکھوں کا تھا لیکن انہوں نے اپنے اعتماد کے سہارے یہ منزل بھی طے کرلی۔ وہ موکلوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بجائے اپنے دفتر میں ہی بیٹھے رہے اور وکالت کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے رہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ ضرورت مند خود ان کے پاس آئے گا۔ اب انہوں نے بمبئی کے بڑے بڑے کلب میں جانا شروع کردیا جہاں کئی ممتاز افراد سے اُن کی ملاقات ہوتی۔ وہ خوش پوشاک اور سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے لہٰذا جلد ہی لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں۔

ان روابط کے ذریعے ان پر قسمت مہربان ہوئی اور دوسرے راستے کھل گئے۔ ایک دوست نے اُن کا تعارف مسٹر میکفرسن سے کروایا جو ان دنوں بمبئی کے قائم مقام ایڈووکیٹ جنرل تھے۔

انہوں نے نوجوان محمد علی کو اپنی ماتحتی میں کام کرنے کی دعوت دی اور ساتھ یہ بھی پیشکش کی کہ وہ اُن کی لائبریری سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔محمد علی پوری زندگی مسٹر میکفرسن کی اس نوازش کے شکر گزار رہے۔

جلد ہی مسٹر میکفرسن کو اندازہ ہو گیا کہ یہ نوجوان کئی خوبیوں کا مالک ہے۔ مستقل مزاج اور دیانتدار ہونے کے ساتھ ساتھ قابلیت میں یکتائے روزگار ہے۔ چنانچہ وہ کبھی کبھار ایک آدھ مقدمہ اُن کے حوالے کر دیتے۔ بار میں کامیابی حاصل کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا لیکن بھائی نے اپنی محنت اور لگن سے یہ سیڑھی بھی پار کر لی۔ کچھ دنوں بعد ان کو خیال آیا کہ اپنا مستقبل محفوظ رکھنے کے لیے سرکاری ملازمت بھی حاصل کرنی چاہیے۔انہوں نے مسٹر میکفرسن سے بات کی اور میکفرسن نے انہیں جوڈیشنل ڈیپارٹمنٹ کے انچارج سر چارلس اولیوانٹ کے پاس بھیج دیا۔دو ہفتے بعد محمد علی کو عارضی پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی ملازمت مل گئی ۲۰۔(۲۰ یکم مئی 1900ء کو یہ عہدہ سنبھالا اور 31، اکتوبر 1900ء تک کام کرتے رہے۔)

اب محمد علی کو اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگی۔ عارضی ملازمت میں ان کی کارکردگی دیکھ کر اعلیٰ افسران بے حد خوش نظر آرہے تھے۔ جب یہ عارضی مدت ختم ہو گئی تو سر چارلس آلیوانٹ انہیں ایک اور ملازمت پیش کر دی جس میں اُن کی تنخواہ پندرہ سو (1500) روپے ماہوار تھی۔ اُس دور میں یہ بہت بڑی تنخواہ سمجھی جاتی تھی۔ مگر جلد ہی اُن کا دل بھر گیا۔انہوں نے سوچا کہ وکالت کے ذریعہ میں ایک دن میں اتنی رقم کما سکتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

جلد ہی کئی کمپنیوں اور لوگوں نے ان کو اپنا وکیل بنانے کی کوشش کی۔ مگر ابھی انہوں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔انہوں نے اپالو ہوٹل کا کمرہ چھوڑ کر اپالو بندر کے علاقے میں ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا اور اُس میں اپنا دفتر قائم کیا۔اس عمارت میں کئی دیگر وکلاء کے دفاتر بھی تھے۔اس دفتر کی تزئین و آرائش کے لیے انہوں نے اچھی خاصی رقم خرچ کی۔ رفتہ رفتہ ان کے قدم جم گئے اور تب انہوں نے والد کو خط لکھا کہ اب وہ خاندان سمیت بمبئی آجائیں۔

کاروبار کی تباہی اور اہلیہ کی وفات سے پہلے ہی والد صاحب دل گرفتہ تھے اور اُن کی طبیعت یہاں نہیں لگ رہی تھی۔اب بیٹا بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔لہٰذا انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ

اب بمبئی منتقل ہو جانا چاہیے۔ اس طرح ہم سب بمبئی آ گئے۔ خوجہ محلّہ میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ بھائی جان اکثر ملنے آیا کرتے۔ اب وہ کافی آسودہ حال ہو چکے تھے لہٰذا خاندان کی کفالت کے ساتھ ساتھ بہنوں اور بھائیوں کی تعلیم کا خرچ بھی اٹھاتے رہے۔

ان کے کردار کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سر چمن لال سیتل واد نے لکھا، ''جب جناح جونیئر وکیل تھے، اس وقت بھی وہ بڑے جری اور بہادر تھے۔ انہوں نے ہمیشہ آزادی اور جرأت کا علم تھامے رکھا اور کسی کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیا۔'' ۲۱ (۲۱ سر چمن لال سیتل واد، یادوں کا مجموعہ، مطبوعہ بمبئی 1946ء صفحہ 66)۔

مسٹر اسٹرانگ مین بمبئی بار کے ایک سینئر اور معزز رکن تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے محمد علی اور اسٹرانگ مین ایک مقدمے میں بیک وقت وکیل تھے۔ محمد علی کو مشاورت کے لیے اُن کے کمرے میں جانا پڑا تو انہوں نے نہایت ہتک آمیز رویہ اختیار کیا۔ محمد علی نے اُس دن کے بعد سے اُن سے بات کرنا چھوڑ دیا بلکہ باہر کہیں بھی اگر آمنا سامنا ہو جاتا تو سلام دعا نہ کرتے۔

ایک مرتبہ وہ جسٹس مرزا کے حضور پیش ہوئے۔ ان دنوں محمد علی بمبئی بار کے نئے نئے رکن بنے تھے۔ دلائل پیش کرتے ہوئے جسٹس مرزا نے ان پر رعب ڈالنے کی کوشش کی۔ محمد علی نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا اور جج سے کچھ کہنے لگے۔ جسٹس مرزا نے اس کو اپنی توہین سمجھا اور محمد علی سے کہا کہ آپ کا یہ انداز توہینِ عدالت کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ اور پھر سیتل واڈ کی طرف رخ کر کے پوچھا ''مسٹر سیتل! کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟'' سر چمن لال سیتل واڈ نے یہ واقعہ اپنی کتاب میں لکھا:

''جسٹس مرزا کا یہ سوال نہایت احمقانہ تھا۔ بہرحال اُن کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ یہ فیصلہ آپ ہی کو کرنا ہے کہ مسٹر جناح نے توہینِ عدالت کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں۔ میں جو سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ جناح نے اس ارادے سے یہ فعل نہیں کیا تھا۔'' ۲۲ (۲۲ سر چمن لال سیتل واڈ، یادوں کا مجموعہ، مطبوعہ بمبئی 1946ء صفحہ 67)

محمد علی نے اس طرح اپنے غصے کا اظہار کیا:

''میں نے اُسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ کبھی جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش نہیں ہوں گا۔''

قوم یتیم ہوگئی:

کراچی میں قائد اعظم کے مزار کو میں جب جب بلند ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں تو میرے ذہن میں 11، ستمبر 1948ء بروز ہفتہ کے دن کی ستم رسیدہ اور المناک یادیں دستک دینے لگتی ہیں۔اسی روز میں اپنے بھائی سے محروم ہوگئی اور یہ قوم یتیم ہوگئی۔چالیس (40) سال سے زیادہ میں نے اُن کی رفاقت میں گزارے اوراس عرصہ میں، میں نے کیا کیا دیکھا، یہ سب کچھ دکھی دل سے بیان کرنے سے قبل میں نے یہ مناسب خیال کیا کہ پہلے اُن کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھوں، پھول چڑھاؤں اوردل بھر کے آنسو بہاؤں۔جب دل کے قریب رہنے والے لوگ اچانک نظروں سے اوجھل ہو جائیں تو پسماندگان کے پاس اس کے علاوہ اور کیا رہ جاتا ہے۔اب وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔یہ کتاب اُن کی زندگی، کارناموں اور جدوجہد کے واقعات پر مشتمل ہے۔انہوں نے کئی سال مایوسیوں کے دن بھی گزارے ہیں لیکن کامیابی نے بالآخر اُن کے قدم چومے۔یہاں میں نے پاکستان کے تصور، فلسفہ اور نظریئے کو بیان کرنے کی اپنے طور پر پوری کوشش کی ہے۔

قدرت نے انہیں قوت ارادی کی بے پناہ طاقت عطا کی تھی، مگر اس قوت کو بخشنے کے لیے ایک ایسا نحیف ونزار جسم کا انتخاب کیا گیا جو اُن کی ذہنی صلاحیتوں اور وقت کی تیز رفتاری سے قدم ملا کر چلنے کے لیے مناسب نہ تھا۔اوراس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اُن کی صحت ان مشکلات کا ساتھ نہ نبھا سکی اور وہ جلد ہی اپنی قوم کو بے سہارا چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔آخری دس برسوں کے دوران ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔یہ وہ وقت تھا جب اُن کی عمر اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ڈاکٹروں کے مشورے اور بہن کی التجاؤں کو انہوں نے درخور اعتنا نہ سمجھا، نہ اپنی صحت کا خیال کیا اور اپنی بچی کھچی توانائی کو قوم کی بھلائی کے لیے قربان کر دیا۔ان کی رو بہ زوال صحت کو دیکھتے ہوئے جب میں کبھی ان کو زیادہ کام نہ کرنے کا مشورہ دیتی اور کہتی کہ وہ ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک طوفانی دورہ کو کچھ دنوں کے لیے موقوف کر دیں، تو وہ کہتے: ''کیا تم نے کبھی ایسا سنا ہے کہ کسی جنرل نے ایسے نازک وقت پر چھٹی کر لی ہو جبکہ اُس کی فوج میدان جنگ میں بر سر پیکار ہو؟''

کہا جاتا ہے کہ وہ مضبوط سے مضبوط مقدمے کو ایک ہی دلیل اور مختصر جملے میں بھگا دیتے تھے۔ ایسے مواقع پر میں منطق چھوڑ کر جذبات کا سہارا لیتی اور کہتی، "آپ کی زندگی بڑی قیمتی ہے۔ آپ کو اپنا مناسب خیال رکھنا چاہیے۔"

وہ کہیں دور خلاؤں میں گھورنے لگتے اور کہتے، "میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے بارے میں فکر مند ہوں۔ اُن کا مستقبل خطرے میں ہے۔ کیا ایسے موقع پر میں انہیں چھوڑ دوں؟"

اُن کی یہ بات اور جذبات کا اظہار میری زبان بند کر دیتی اور وہ اپنی صحت کو نظر انداز کر کے اپنی سیاسی جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔

فروری 1937ء میں قانون ہند مجریہ 1935ء کے تحت ہندوستان میں عام انتخابات کرائے جا رہے تھے۔ مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ اُس وقت مسلم لیگ پوری طرح منظم اور متحد نہ تھی اور نہ ہی اُس کا پیغام عوام تک صحیح طریقے سے پہنچ سکا تھا اس موقع پر رائے عامہ کو ہموار کرنے اور تنظیم کو منظم کرنے کا تمام کام اُن کے کاندھوں پر آن پڑا۔ مسلم لیگ کا پیغام پہنچانے کے لیے انہیں شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں جانا پڑا اور مختلف مقامات سے اُنہیں بلاوا بھی آ رہا تھا اور ہر جگہ حتی الامکان جانے کی کوشش کرتے۔ آہستہ آہستہ مسلمانوں میں یہ شعور اُجاگر ہو رہا تھا کہ جب تک وہ متحد نہیں ہوں گے، ان کا سیاسی مستقبل محفوظ نہیں ہو گا۔

میں ہر سفر میں اُن کے ساتھ ہوتی اور مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی کہ مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اُن کی تقریر کے دوران سامعین اور شائقین کا ہجوم دیکھ کر میرا ڈھیروں خون بڑھ جاتا کہ مسلمانوں کے دلوں اور ذہنوں میں مسلم لیگ کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں اور میرے بھائی کی مقبولیت میں بھی گوناگوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اپنی تقریر میں جب وہ یہ کہتے کہ آپ کے ہاتھوں میں بہت بڑی طاقت ہے اور مستقبل میں آپ کا کردار فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے تو فضا دیر تک تالیوں سے گونجتی رہتی اور پھر وہ اپنی گرجدار آواز میں کہتے "ہر شخص کو یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ مسلم لیگ قائم رہنے کے لیے بنی ہے اور اس کو برباد کرنے کی تمام سازشیں ناکام ہو کر رہیں گی۔ مسلمانوں کا شعور بیدار ہو چکا ہے اور ان کے عزم کو دنیا کی کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔"

ان کی پر اثر تقریر جب ختم ہوئی تو ہر طرف فلک شگاف نعرے گونجنے لگے، "مسلم لیگ زندہ

باد، محمد علی جناح زندہ باد۔"

جب 1940ء میں لاہور کے اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو انہوں نے اپنی گرتی ہوئی صحت کے اور روز افزوں کام میں اضافے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی قوت کو مجتمع کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ آج کے بعد مطالبۂ پاکستان میں مزید اضافہ کریں گے اور تاریخ کا ایک درخشاں باب روشن کر کے رہیں گے۔ مسلسل سفر اور کام کی پریشانیوں نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈال رکھا تھا مگر وہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے۔ اُن کا قد پانچ فٹ، ساڑھے دس انچ تھا اور وزن 112 پونڈ جو کہ آہستہ آہستہ اور کم ہوتا جا رہا تھا۔ پھر بھی وہ مستقل بے نیازی کا مظاہرہ کرتے رہتے۔ انہیں یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ کوئی ان کے کام میں حائل ہو۔ التجاؤں اور دلائل کے ذریعہ آخر میں نے انہیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ نامور ڈاکٹروں سے مشورہ کریں۔ وہ بادل ناخواستہ تیار تو ہو گئے مگر اپنے فرائض سے غافل نہ ہوئے۔

صدر مسلم لیگ کے طور پر اپنی تمام تر ذمہ داریوں اور فرائض کے ساتھ ساتھ انہیں مرکزی مجلس قانون ساز ہی پارٹی لیڈر کا منصب بھی دے دیا گیا۔ کئی دنوں سے بیمار ہونے کے باوجود نومبر 1940ء میں دہلی میں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی سے روانہ ہوئے، ٹرین اپنی پوری رفتار سے رواں دواں تھی۔ وہ بستر میں لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم آہنی سلاخ اُن کی پشت پر لگا دی ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے بے ساختہ چیخ پڑے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کا سبب پوچھا۔ درد کی شدت نے اُن کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ اسی حالت میں اپنی انگلی سے انہوں نے ریڑھ کی ہڈی کی طرف اشارہ کیا۔ درد کو کم کرنے کے لیے میں نے اُن کے جسم کے اس حصے پر مالش شروع کر دی کیونکہ چلتی ہوئی ٹرین میں طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ مگر میری مالش سے اُن کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ مایوس ہو کر میں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ میں نے سوچا کہ کسی اگلے اسٹیشن پر گرم پانی کا انتظام کر لوں گی۔ تھوڑی دیر بعد ایک اسٹیشن آ گیا اور گارڈ سے کہا کہ فوری طور پر گرم پانی کی بوتل کا بندوبست کیا جائے۔ بوتل کو نیپکن میں لپیٹ کر میں نے دھیمے دھیمے درد والی جگہ پر ٹکور شروع کی تو درد میں قدرے آرام آیا۔

ٹرین علی الصبح دہلی اسٹیشن پر کھڑی ہو گئی اور ہم اپنی رہائش گاہ 10۔ اورنگزیب روڈ کی طرف

چل دیئے۔ سہارا دے کر میں بھائی کو بستر تک لے گئی اور فون کر کے فوراً اُن کے ڈاکٹر کو بلالیا۔ تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کو پھیپھڑوں کی سوزش کی بیماری ہے اور ان پر اسی کا حملہ ہوا تھا۔ اب انہیں دو ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔

یہ سنتے ہی بھائی جان چلا اٹھے، ''یہ کیا بد قسمتی ہے۔ یہ اجلاس انتہائی اہم ہے اور اس میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔ میں آرام کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''

دو دن بستر میں پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کام میں مصروف ہو گئے۔ مرکزی اسمبلی کا نہایت اجلاس ہونے والا تھا۔ جنگ عظیم میں ہندوستان کی شمولیت کے متعلق مسلم لیگ کے موقف کی وضاحت ان کے ذمہ تھی۔ میں اُس وقت حیرت سے دو چار ہو گئی جب وہ مہمانوں کی گیلری سے خطاب کرنے کے لیے اپنی نشست سے اٹھے۔ ان سے چہرے اور انداز سے اُن کے عزم کا اظہار ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیماری کو بھول چکے ہیں اور فرض کی بجا آوری کے لیے سینہ سپر ہیں۔ تقریر کے آغاز میں اُن کی آواز ذرا کمزور تھی لیکن جوں جوں تقریر آگے بڑھتی گئی، ان کی آواز میں گھن گرج پیدا ہوتی چلی گئی اور وہ اپنے اصلی روپ میں سامنے آگئے۔ مسلمانوں کی تضحیک اور تذلیل کو وہ برداشت نہ کرسکے اور تمام گھناؤنے پروپیگنڈے کا تمسخر اڑاتے ہوئے انہوں نے کہا:

''بلاشبہ پروپیگنڈہ بہت سے نقصانات پہنچا سکتا ہے لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو خوف و ہراس سے بالاتر ہیں۔ کمزور فریق کو برا بھلا کہنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ لیکن ہم ایسے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔ اگر کانگریس فتح حاصل کر لیتی ہے تو یہ میرا قصور نہیں ہوگا۔ یہ آپ کے آئین کی غلطی ہے۔ میں ببانگ دہل اعلان کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہ ہونے کا بنیادی سبب یہی آئین ہے۔ کانگریسی قائد خواہ کچھ بھی کہتے رہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کانگریس سو فیصد ایک ہندو تنظیم ہے، اور ان کے ذہنوں میں تصور موجود ہے کہ مسلمانوں کو بالآخر کانگریس اور ہندو راج میں آنا پڑے گا۔ مسلمان ایک اقلیت ہیں اور اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے وہ اصرار کرسکتے ہیں۔ میں کانگریس اور ان کے اراکین پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمان ایک جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور ان کے حقوق پر کوئی ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔''

مسٹر ایم۔ ایس اینے نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا: ''مسٹر جناح کا یہ نظریہ 1920ء سے

پہلے تک تو نہ تھا۔"

قائداعظم نے جواب میں کہا: "1916ء سے۔ کیونکہ میثاق لکھنؤ دوالگ الگ قوموں کے بنیادی حقوق پر قائم ہوا تھا۔"

ایم۔ ایس۔ ایسنے نے شدید غصے کے عالم میں کہا، "میں وہاں موجود تھا۔"

قائداعظم نے اُن کا غصہ بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ اطمینان سے کھڑے ہوئے اور دھیمے انداز میں کہا: "میرے دوست یقیناً وہاں موجود رہے ہوں گے لیکن اس وقت تک میں نے ان کا نام نہیں سنا تھا۔"

یہ سن کر مسٹر ایسنے خاموش ہو گئے۔

مسٹر جناح کی تقریر ایک گھنٹے تک جاری رہی اور یہ تقریر انہوں نے کھڑے ہو کر کی۔ تقریر ختم کرتے ہوئے انہوں نے کہا، "بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی تقریر میں دو باتوں پر زور دیا ہے۔ جمہوریت اور قومی حکومت۔ قومی حکومت کیا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے؟ کابینہ کیسی ہوگی اور کیا مقننہ کو جواب دہ ہوگی؟ کیا وہ منتخب اراکین کے دو تہائی کی قیادت کر سکتے ہیں۔ مجھے شدید حیرت ہے کہ کیا وہ اس کابینہ میں ہوتے ہوئے کانگریس کے ہدایات کی تعمیل نہ کرے گا؟"

جب ہم اسمبلی سے واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور سگریٹ پکڑنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ گھر پہنچتے ہی وہ بستر پر ڈھیر ہو گئے اور کپڑے بھی تبدیل کرنے کی ہمت نہ پا سکے۔

جہاں تک میں جان سکی ہوں، پھیپھڑوں کی سوزش (پلوریسی) اُن کی بیماری کی اصل جڑ تھی جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی۔ اگر وہ مناسب علاج اور احتیاط کرتے تو اس مرض کا علاج ہو سکتا تھا۔ اس کے چند ماہ بعد کا ذکر ہے۔ اپریل 1941ء میں بمبئی سے مدراس جا رہے تھے جہاں اُن کو آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کرنا تھی۔ ہماری ٹرین ابھی مدراس سے کچھ فاصلے پر تھی کہ انہیں غسل خانہ جانے کی حاجت ہوئی۔ وہ اٹھے، لیکن دو چار قدم چل کر لڑکھڑا گئے اور ٹرین کے چوبی فرش پر گر کر نڈھال ہو گئے۔ میں نے پوچھا، "کیا ہوا؟" ایک روکھی پھیکی مسکراہٹ ان کے چہرے پر نمودار ہوئی اور کہنے لگے، "بہت کمزوری اور تھکاوٹ سی محسوس کر رہا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے

انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی نشست کی طرف بڑھے۔ چند منٹوں بعد ٹرین ایک بڑے جنکشن پر پہنچ گئی۔ ہزاروں افراد پلیٹ فارم پر جمع تھے اور ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور چلا کر کہا: ''قائداعظم سخت بیمار ہیں۔ شور مت مچاؤ اور جلدی سے ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔''

چند منٹ میں ڈاکٹر صاحب آ گئے اور معائنہ کرنے کے بعد بتایا ''کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ آپ کو ہلکا سا نروس ڈاؤن کا دورہ پڑا تھا۔ آپ کو ایک ہفتے تک بستر پر مکمل آرام کرنا ہے۔''

مدراس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں ہزاروں مندوبین آئے ہوئے تھے۔ مگر قائداعظم شدید نقاہت کے باعث پہلے دن خطاب نہ کر سکے۔ لیکن دوسرے دن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنا صدارتی خطبہ پڑھیں گے۔ میں نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن جب یہ دیکھا کہ وہ بضد ہیں تو استدعا کی کہ آپ مختصر تقریر کریں اور انہوں نے مجھے یقین دہانی کرا دی۔ لیکن جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انہوں نے نوٹس کے بغیر اپنی تقریر شروع کی اور تفصیل سے اپنے خیالات کی وضاحت کی۔ یہ تقریر دو گھنٹے سے زیادہ دیر چلتی رہی۔ وہ ایسے بہادر اور اولوالعزم رہنما تھے جو اپنی علالت کی پرواہ کیے بغیر مسلمانوں کے حقوق کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

''میں نہایت واضح الفاظ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کیا چاہتی ہے۔ ہماری منزل مقصود یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے میں ایسی ریاستوں کا قیام چاہتے ہیں جس کے پاس دفاع، امور خارجہ، مواصلات، کسٹمز، کرنسی اور ایکسچینج وغیرہ کا مکمل اختیار ہو۔ کل ہند نوعیت کا ایسا آئین نہیں چاہتے جس میں ایک مرکزی حکومت ہو۔ مسلمان اس پر کبھی راضی نہ ہوں گے۔''

مجھے ان کی کارکردگی دیکھ کر بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی اور میں اپنے بھائی کو فخر کی نگاہ سے دیکھا کرتی۔ بس خطرہ اُن کی جان کی طرف سے تھا۔ وہ کام کی مصروفیت میں اپنی کمزوری اور بیماریوں کو فراموش کیے بیٹھے تھے۔

قیام پاکستان سے پہلے کا سات سال کا عرصہ ان کی زندگی کے نہایت اہم اور مصروف ترین دن تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے دن رات شدید اور انتھک محنت کی جس کے بدلے

میں عوام نے بھی انہیں پوری حمایت اور عزت سے نوازا اور انہیں قائداعظم کا خطاب عطا کیا۔لیکن اُن کی صحت اب کسی بوجھ کو اٹھانے کے قابل نہ تھی۔وہ بستر علالت سے جب اٹھنے بیٹھنے کی کوشش کرتے تو بڑی تکلیف محسوس کرتے۔ان کا لباس ہمیشہ صاف ستھرا ہوتا لیکن چہرے پر تھکاوٹ اور بیماری کے آثار صاف دکھائی دیتے۔جب کسی جلسے میں جا رہے ہوتے تو تمام راستہ خاموشی سے طے کرتے۔ شاید اپنی توانائی محفوظ رکھنے اور خیالات کو قابو میں رکھنے کے لیے ایسا کرتے ہوں۔عوام کا جم غفیر دیکھ کر وہ سر تسلیم خم کرتے اور ان کے نعرہ ہائے تحسین کا جواب دیتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ایسے مواقع پر اُن کے قدموں میں استقامت پیدا ہو جاتی اور ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی۔ اس طرح وہ اسٹیج پر پہنچ جاتے۔مقامی رہنماؤں کی تقریروں کے بعد وہ مائیک کے پاس آجاتے اور عوام پر نظر ڈالتے ہوئے ایسی گھن گرج سے تقریر کرتے کہ کسی کو شک بھی نہ ہوتا کہ وہ بیمار ہیں۔وقفے وقفے سے ''قائداعظم زندہ باد'' کے نعرے بلند ہوتے اور وہ عوام کے نعروں کے جواب میں ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کی امیدوں اور امنگوں کی جوت کو جگائے رکھتے۔

جب تقریر سے فارغ ہو کر گھر واپس آتے تو آتے ہی نڈھال اور بے سدھ ہو کر بستر پر گر جاتے۔اُن کے اندر یہ صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ جب چاہیں سو جائیں اور جب چاہیں جاگ جائیں۔انہیں ہر صبح کئی خطوط اور درخواستیں موصول ہوتیں اور ان کو کئی اہم معاملات کا فیصلہ کرنا پڑتا۔وہ ایک ایسی بے چین روح جس کے اندر خدمت اور محبت کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا چنانچہ وہ ہر کام پوری تندہی اور ایمانداری سے نبھا کر ہی دم لیتے تھے۔مگر بیماری تھی کہ برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

بالآخر مطالبہ پاکستان تسلیم کر لیا گیا اور 14/15 اگست 1947ء میں ایک نئی مملکت کا قیام وجود میں آگیا۔کراچی کی سڑکوں پر خوشیوں سے معمور عوام کا ریلا جشن آزادی منا رہا تھا لیکن انہیں بالکل خبر نہیں تھی کہ اُن کا قائد کس قدر شدید علیل اور کمزور ہے۔بہر حال قوم کو اُن کی منزل مل گئی تھی اور یہ اُن کی کامیابی کی ابتدا تھی۔لیکن قائداعظم کا سفر ابھی تمام نہیں ہوا تھا۔اس نئی مملکت کو انتہائی سنگین مسائل کا سامنا تھا اور سربراہ مملکت کی حیثیت سے اس ڈوبتی ابھرتی کشتی کو ساحل پر پہنچانے کی ذمہ داری ان کی تھی۔

اب قائداعظم کی جسمانی صحت اطمینان بخش نہیں رہی تھی، ان کی بھوک روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔اپنی مرضی سے ان کے سونے جاگنے کی طاقت بھی اب پہلے جیسی نہیں تھی۔کئی کئی راتیں

وہ کروٹیں بدل بدل کر اور جاگ جاگ کر گزار دیتے۔ان کی کھانسی تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی اور بخار بھی رہنے لگا تھا۔مسلمانوں کے قتل عام، عصمت دری، لوٹ مار اور دیگر دل خراش واقعات کی خبریں سن کر ان کی ذہنی حالت مزید بگڑتی چلی گئی۔کبھی کبھی جب وہ ان اندوہناک واقعات پر مجھ سے تبادلہ خیالات کرتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور اُن کا سینہ غم سے پھٹنے لگتا۔ جو مہاجرین بچ بچا کر چلے اُن کے مصائب بھی بے شمار تھے اور وہ اُن کی فلاح و بہبود کے انتظام کے بارے میں سوچ سوچ کر بے حال ہو جاتے۔جب کچھ وقت ملتا تو تھوڑا بہت مطالعہ کر لیتے۔ کشمیر کا مسئلہ بھی اُن کے لیے سوہانِ روح بن گیا تھا۔دنیا کے نقشے پر اگر چہ پاکستان کا نقشہ ابھر چکا تھا لیکن یہ مملکت ابھی جدوجہد کے ابتدائی مراحل سے دو چار تھی اور اسے اپنا مقام پیدا کرنا تھا۔ان مسائل پر وہ صبح و شام گفتگو کرتے رہتے اور سوچ بچار میں مصروف رہتے جس کی وجہ سے اُن کا ذہنی سکون تباہ کر کے رکھ رہا تھا۔کراچی آمد کے بعد کراچی کلب میں ان کو ایک عشائیہ دیا گیا [1] (1 یہ عشائیہ صوبہ سندھ کے گورنر غلام حسین ہدایت اللہ کی جانب سے دیا گیا تھا۔ - 1879) (1948 اس تقریب میں انہوں نے فرمایا:

''اُن دنوں جب مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے پابند سلاسل کر دے گی تو ایسے نازک موقع پر میری بہن ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور امید افزا باتوں سے میری ڈھارس بندھائے رکھی۔انہوں نے میری صحت کا بھی بے حد خیال رکھا اور کسی موقع پر محسوس نہ ہونے دیا کہ میں کمزور پڑ گیا ہوں اور اب کوئی بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔''

لیکن سامعین کو ذرا بھی احساس نہ تھا کہ ان کے لیڈر کی صحت کس قدر خراب ہے۔بہر حال قائداعظم کی زندگی کا مقصد پورا ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہ قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے۔اگر چہ خرابی صحت نے اُن کی توانائی کو زنگ آلود کر دیا تھا لیکن ان کی روح ناقابل تسخیر تھی اور ہر طرح کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کا جذبہ اُن کے اندر موجود تھا۔

ان کی بڑھتی ہوئی بیماریوں نے مجھ پر بھی حملہ کر دیا اور میری پریشانی بڑھتی چلی گئی۔میرے اصرار پر وہ اپنے ذاتی معالج [2] (2 ڈاکٹر کرنل عبدالرحمٰن (1955 - 1882) قائداعظم کے پرنسپل فزیشن تھے اور قیام پاکستان سے پہلے وہ ریاست بھوپال میں چیف میڈیکل آفیسر تھے۔)

سے معائنہ کرانے پر رضامند ہو گئے۔ ڈاکٹر کی دواؤں سے وہ اکثر گریز کرتے تھے۔ ان کی اس عادت نے بھی مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ کرنل رحمٰن نے معائنے کے بعد بتایا کہ انہیں معمولی نوعیت کا ملیریا ہے۔ قائداعظم نے ڈاکٹر سے ایسے متعدد سوالات کیے گویا وہ عدالت میں گواہ پر جرح کر رہے ہوں۔ وہ ڈاکٹر کی وضاحت سے متاثر نہ ہوئے اور ان کی تجویز کردہ دوائیں استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔

کھوکھراپار۳(۳ لکھنے والے نے غلطی سے کھوکھراپار لکھ دیا ہے، لاہور کی سرحد پر واہگہ ہے نہ کہ کھوکھراپار) کی سرحد کے راستے مہاجرین پاکستان آ رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ مہاجرین کے کیمپ کے انتظامات دیکھنے کے لیے فوراً لاہور میں موجود رہیں۔ ان کے سامنے اب صرف دو ہی راستے تھے۔ یا تو اپنا فرض پورا کرتے یا اپنی صحت کا خیال کرتے۔ انہوں نے فرض کی پکار پر لبیک کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ کراچی پہنچنے کے تقریباً ایک ماہ بعد ہم دونوں ستمبر 1947ء میں لاہور چلے گئے اور چند روز قیام کرنے کے بعد کراچی واپس آ گئے۔ ابھی صرف تین ہفتے ہی گزرے تھے کہ اکتوبر میں دوبارہ لاہور جانا پڑا۔ پاکستان کے حصول کے بعد اس مملکت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا بھی اُن کے لیے انتہائی اہم فریضہ تھا۔ قوم شدید بحران میں مبتلا تھی اور وہ اپنی ذمہ داریوں سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ 30، اکتوبر 1947ء کو یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں ایک عظیم الشان جلسے سے خِطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''چند لوگوں کے خیال میں تین (3) جون کا منصوبہ قبول کرنا مسلم لیگ کی ایک غلطی تھی۔ میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی متبادل صورت میں نتائج مزید تباہ کن ثابت ہوتے۔ ہم نے پوری نیک نیتی اور صدقِ دل سے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تھا۔ تاریخ یہ حقیقت ثابت کر کے رہے گی۔ لیکن چند غداروں نے اس سازش میں بڑھ چڑھ کر ہاتھ دکھائے اور ملک میں بدنظمی اور افراتفری پیدا کی جس کی وجہ سے بے شمار اموات واقع ہوئیں۔ لوگوں کے گھر تباہ ہو گئے اور نہ جانے کتنی عصمتیں لوٹی گئیں۔ یہ سب کچھ اس قدر منظم طریقے سے ہوا کہ بڑے بڑے جابر اور وحشی بھی شرمندہ ہوتے رہیں گے۔ ہم ایک گہری اور خطرناک سازش کا شکار ہو گئے۔ ہم نے اپنی جانب سے اس سازش کا مقابلہ کرنے کی بھرپور کوشش کی اور کافی حد تک کامیاب رہے۔

ہماری سب سے بڑی قوت ایمان کی قوت ہے۔ اگر ہم اسی طرح قرآن کی ہدایت پر عمل کرتے رہے تو آخری فتح ہماری ہوگی۔ انشاء اللہ۔ موت کے خوف سے آپ پیچھے نہ ہٹیں۔ پاکستان اور اسلام کے لیے ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ یہاں تک کے لیے اس نیک مقصد کے لیے اگر آپ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑے تو اُسے بھی ہنسی خوشی قبول کر لیجیے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کو ختم نہیں کر سکتی۔''

مہاجرین کی امداد اور تسلی کے لیے انہوں نے ہر وہ کام کیا جو اُن کے بس میں تھا۔ اس کے بعد ہم کراچی واپس آ گئے۔ مہاجروں کے مصائب اور مشکلات نے اُن کی صحت پر اور برا اثر ڈالا اور وہ نڈھال ہو کر رہ گئے۔ کام کی رفتار روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اسی طرح اُن کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ ہدایات حاصل کرنے کے لیے سیکریٹری صاحبان اور دوسرے کارکنان مسلسل آتے رہتے۔ ایسے میں ان کو سکون کہاں سے میسر آتا۔

سرحد والوں نے ریفرنڈم کے ذریعہ پاکستان میں شمولیت کا جو فیصلہ کیا تھا، اُس کے لیے وہ ان کے بے حد شکرگزار تھے اور اُن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود پشاور آ کر اظہارِ تشکر کریں گے۔ اپنے وعدے کی پاسداری نبھانے کے لیے ہم اپریل 1948ء میں پشاور گئے، جہاں اُن کا بھرپور استقبال کیا گیا۔ 12، اپریل 1948ء کو اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''حصولِ پاکستان کی تحریک کو اس صوبے اور خصوصاً طلبہ کی طرف سے جو حمایت اور تعاون حاصل رہی ہے، اس کا ہم سب کو اچھی طرح احساس ہے۔ آپ نے ریفرنڈم کے ذریعہ پاکستان میں شمولیت کا جو فیصلہ کیا تھا، اُس کے لیے پوری قوم آپ کی احسان مند ہے۔ مجھے فخر ہے کہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں یہاں کے عوام کسی سے پیچھے نہیں رہے۔''

اگلے روز ہم رسالپور چلے گئے جہاں رائل ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں سے ان کو خطاب کرنا تھا۔ تقسیم کے وقت مفاہمت کے مطابق پاکستان کو جو فوجی ساز و سامان ملنا تھا، اُسے ہندوستان نے روک رکھا تھا۔ لہٰذا ہماری ایئر فورس کے پاس مناسب سامان اور طیاروں کی کمی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا:

''مجھے اچھی طرح یہ احساس ہے کہ آپ کے پاس وسائل کی کمی ہے۔ ہم نے ضروری سامان

کی خریداری کے لیے کام شروع کر دیا ہے اور چند جدید جہازوں کے آرڈر دے دیئے گئے ہیں۔ میں آپ کو یہ بات ایک بار پھر باور کرا دینا چاہتا ہوں کہ افراد اور سامان کی تعداد اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنا کہ آپ کا عزم وحوصلہ اور نظم وضبط۔ میں جانتا ہوں کہ پاکستان ایئر فورس میں یہ جذبات بدرجہ اتم موجود ہیں، لہٰذا اس جذبے کو کبھی بھی سرنگوں نہ ہونے دیجیے۔"

14، اپریل 1948ء کو انہوں نے گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں سول افسران کا اجلاس طلب کیا اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"میں آپ کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ کسی بھی سیاست داں یا کسی بڑے آدمی کے دھونس اور دباؤ میں نہ آئیں اور پوری دیانتداری سے ملک وقوم کی خدمات سرانجام دیتے رہیں۔ حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔ وزیر اور دوسرے حکام آتے جاتے رہتے ہیں، ایسی صورت میں آپ پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آپ کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی وزیر اعظم، آپ کا کام بس پوری وفاداری اور دیانتداری سے حکومت اور عوام کی خدمت کرنا ہے۔ اگر آپ نے اپنا فرض اچھی طرح نبھایا تو پاکستان ایک شاندار مملکت بن کر دنیا کی عظیم قوموں میں اپنا نام روشن کرے گی۔ آپ کو یہ تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ میں لیڈروں اور سیاست دانوں کو بھی یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ کسی بھی صورت میں آپ کے فرائض میں مداخلت نہ کریں اور آپ پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالیں۔ ورنہ پھر رشوت ستانی، بدعنوانی اور اقربا پروری جیسی لعنت ہم پر مسلط ہو جائے گی۔ آپ سب کو ملک اور قوم کے مفاد کے لیے بہت سی قربانیاں دینی ہوں گی۔ آپ کو ہر شخص حق وانصاف کے جذبے سے سرشار ہو کر انتھک کام کرنا ہوگا۔"

اس کے چند دنوں بعد انہوں نے ایڈورڈ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کیا اور اس دن کا تذکرہ کیا جب 1937ء میں مسلم لیگ کو صوبہ سرحد سے شکست ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہاں کے لوگوں کا ضمیر بیدار ہوتا گیا اور بہادر پٹھانوں کی حمیت جاگ اٹھی اور انہوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔ تقریر کا اختتام کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میں آپ پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے شہری ہیں۔ اچھے کاموں پر حکومت کی تعریف کیجیے اور جب کوئی غلط بات دیکھیں تو کھلے دل سے تنقید بھی

کیجیے۔ آپ کی تنقید سے ہم معاملات کو اچھی طرح دیکھ سکیں گے اور آپ کی فلاح و بہبود کو بہتر طریقے سے انجام دے سکیں گے۔"

یہ جلسہ کھلے آسمان تلے ہو رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں گہرے سیاہ بادل چھا گئے۔ پہلے بوندا باندی شروع ہوگئی لیکن عوام بے خطر اور بے نیاز ہو کر اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ میں نے اپنے بھائی کو کہا ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ بارش میں وہ بری طرح بھیگ گئے لیکن وہ اپنی تقریر کو روکنے پر راضی نہ ہوئے۔ رات میں سردی سے نزلہ اور بخار بھی ہو گیا۔ میں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کہا تو انہوں نے منع کر دیا اور کہنے لگے، "یہ معمولی بات ہے، تھوڑی دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن کچھ بھی ٹھیک نہ ہو سکا۔ جب ہم کراچی واپس آئے تو ان کی کھانسی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کو برونکائٹس کا معمولی سا حملہ ہوا ہے اور انہیں آرام کرنا چاہیے۔ وہ بستر سے لگ گئے لیکن اس حالت میں بھی فائلوں کا مطالعہ کرتے رہتے۔ انہیں رو بہ صحت ہونے میں چھ ہفتے لگ گئے۔ کمزوری حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ کہیں باہر چلے جائیں تا کہ کسی صحت افزا مقام پر آپ آرام کر سکیں۔ ڈاکٹر نے بھی اس مشورے کی حمایت کی لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ جب بیماری کا دوبارہ حملہ ہوا تو کسی دوسرے ملک جانے کے بجائے وہ کوئٹہ جانے پر راضی ہو گئے۔ چند ہی روز کے اندر ان کی صحت میں نمایاں بہتری پیدا ہوگئی۔ نیند بھی اچھی آنے لگی، کھانسی کم ہوگئی اور بخار بھی اتر گیا۔ اب صرف صرف فائلیں ان کو بھیجی جاتی تھیں اور انہیں آرام کا کافی وقت مل جاتا تھا۔

بعض اوقات وہ عوامی تقریبات میں جانے لگے تھے۔ ایسے موقع پر وہ پاکستان کو درپیش اہم مسائل پر ہی گفتگو کرتے اور اپنا نقطہ نظر واضح کرتے۔ پارسی برادری کی جانب سے دی گئی دعوت میں (کوئٹہ کی پارسی برادری کی طرف سے 13، جون 1948ء کو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا۔) میں انہوں نے فرمایا:

"پاکستان کے مسائل کو دیکھتے ہوئے آئین تیار کرنے میں کچھ مشکلات سامنے آ رہی ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ تقریباً دو سال کے عرصے میں ہم یہ کام مکمل کر لیں گے۔"

آئین کے بارے میں وہ اکثر میرے ساتھ تبادلہ خیال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان کا آئین ایسا بننا چاہیے جو لبرل ہو اور عوام کی بنیادی آزادی کا ضامن ہو۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ایک ایسا آئین ہوگا جو پاکستان اور پاکستان کے عوام کے شایان شان ہوگا۔ لیکن اُن کی بیماری کی وجہ سے یہ انتہائی اہم کام التواء کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔

پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''میری حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ بلا امتیاز ذات، رنگ، عقیدہ اور نسل کے ہر طبقے اور ہر فرد کی جان و مال کا مکمل تحفظ ہونا چاہیے۔ پاکستان میں ہر قیمت پر امن قائم رہنا چاہیے۔''

دوسرے روز انہوں نے اسٹاف کالج کوئٹہ کے افسروں سے خطاب کیا، ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض افسران اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ افواجِ پاکستان نے جو حلف اٹھایا ہے، وہ کیا ہے اور کس مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ حلف محض رسمی نہیں بلکہ یہ ایک سچا جذبہ ہے جس میں مذہب اور پاکستان سے قلبی وابستگی کو اہمیت دی گئی ہے۔ میں آپ کو یہ حلف نامہ دوبارہ پڑھ کر سناتا ہوں:

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر صدق دل سے عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور ڈومینین آف پاکستان اور پاکستان کی مسلح افواج کی ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ خدمات بجالاؤں گا اور ملازمت کی شرائط پر عمل کرتے ہوئے ان تمام مقامات پر جاؤں گا جہاں مجھے جانے کا حکم دیا جائے گا۔ میں آپ کو یاددلانا چاہتا ہوں کہ آپ آئین کا بغور مطالعہ کریں۔''

15، جون 1948ء کو کوئٹہ میونسپلٹی کے دیئے گئے استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے بڑے دکھی دل سے کہا کہ مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ پاکستان میں صوبہ پرستی کی لعنت پھلتی پھولتی جا رہی ہے۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہاں کوئی بلوچی ہے نہ سندھی، پنجابی، پٹھان اور بنگالی۔ یہاں سب کے سب صرف پاکستانی ہیں۔ بنیادی طور پر ادارے اور حکومت کے نمائندے ٹھیک ٹھاک ہیں لیکن اگر کوئی ذاتی مفادات کو مقدم رکھ لے اور ملکی مفاد کو پس پشت ڈال دے تو ملک استواری بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا اور بدنامی و شکست و ریخت ہمارا مقدر بن جائے گی۔ آپ اپنے کردار اور اعمال کا محاسبہ کرتے رہیں اور ہر حال میں ملکی مفادات کو ترجیح دیں۔''

کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی طرف سے دی گئی دعوت یکم جولائی، 1948ء کو

قرار پائی تھی اور انہوں نے یہ دعوت قبول کرلی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ کراچی گئے اور تقریب میں شرکت کے بعد واپس کوئٹہ آئے تو اس طرح اُن کی صحت پر برا اثر پڑسکتا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اس موقع کے لیے آپ کی تقریر کراچی میں کوئی اور پڑھ کر سنادے۔ تب انہوں نے یہ جواب دیا:

''یہ سب ملک کے وقار اور عظمت کا سوال ہے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، کانگریس اور ہندوؤں نے کہا تھا کہ پاکستان کے لوگ صنعت، تجارت، بینکاری، جہاز رانی اور انشورنس وغیرہ جیسے معاملات سے نابلد ہیں اور وہ ملک نہیں چلا سکیں گے۔ اب ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہمارے جوانوں میں تمام صلاحیتیں موجود ہیں اور ایک آزاد ملک کو آزادانہ طور پر چلا سکتے ہیں۔ میری صحت اب خطرے سے باہر ہے اور جو میرا فرض ہے، وہ مجھے ہر حال میں ادا کرنا ہے۔''

لیکن کوئٹہ سے کراچی اور کراچی سے کوئٹہ کے سفر نے ان کی صحت پر اچھا خاصا اثر ڈالا اور اُن کی کمزوری فزوں تر ہوگئی۔ افتتاح کے دن ہی وہ بستر پر دراز تھے لیکن انہوں نے اپنے جوش وجنوں کو بیدار کیا، مناسب لباس زیب تن کیا اور اجتماع کے سامنے خطبہ پڑھا۔ انہوں نے پرزور آواز میں کہا:

''آج کا دن ہمارے لیے یقیناً باعث مسرت اور باعث فخر ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح یہ ثابت کرتا ہے کہ ہم نے آزادی حاصل کرلی ہے اور ہم ہر معاملے میں خودمختار اور خودکفیل ہیں۔ آپ یقیناً یہ بات جانتے ہیں کہ غیر منقسم ہندوستان میں بینکاری کا زیادہ تر انتظام والصرام غیر مسلموں کے پاس تھا اور جب تقسیم کے بعد وہ لوگ پاکستان سے چلے گئے تو ہماری نوزائیدہ مملکت کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک کی معیشت کو رواں دواں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس خلا کو بلا تاخیر پُر کیا جائے۔ ہماری پالیسی یہ ہے کہ قیمتوں کو مناسب سطح پر مستحکم رکھا جائے۔ مغرب کے اقتصادی نظام نے دنیا بھر کے لیے مسائل کھڑے کردیئے ہیں جس کو اب صرف کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ دو عالمی جنگوں کی وجوہات بھی مغرب کی غلط پالیسی کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا مغرب کی تقلید کے بجائے ہمیں اپنی راہیں خود تلاش کرنی پڑیں گی۔ اس کا حل صرف اور صرف اسلام اور اسلام کا نظام ۔ ل میں مضمر ہے۔''

خرابی صحت کی بناء پر قا۔ اعظم کی آواز میں کافی نقاہت تھی۔ یہ بات سننے والوں نے بھی محسوس کی اور دیکھنے والوں نے ُ ں۔ درمیان میں وہ اکثر رک جاتے اور کھانسنے لگتے۔ جب ہم

واپس گورنر ہاؤس آئے تو وہ جوتوں اور کپڑوں سمیت بستر پر بے سدھ ہو کر لیٹ گئے۔ لیکن ہمت پھر بھی جواں تھی۔ شام کو امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر ایک استقبالیہ تھا جہاں ان کا جانا ضروری تھا۔ اپنی صحت کی خرابی کو انہوں نے ایک طرف رکھا اور فرض کی ادائیگی کے لیے تیار ہو گئے۔ پارٹی میں بھی انہوں نے اپنے وقار کو بحال رکھا اور کمزوری یا تھکن کا اظہار نہ ہونے دیا۔ مہمانوں کے ساتھ انہوں نے گھل مل کر اور خوش مزاجی سے باتیں کیں۔ تقریب ختم ہونے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ اُس وقت بھی وہ خوش وخرم دکھائی دے رہے تھے۔

کراچی میں ہمارا قیام پانچ دن رہا، اس دوران وہ اہم فائلوں کو بھی نمٹاتے رہے۔ کوئٹہ واپس آتے ہوئے جہاز میں وہ ٹھیک ٹھاک تھے مگر اگلے روز سفر کی تھکان اور محنت کی وجہ سے بے دم سے ہو کر رہ گئے۔ بخار نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ کئی سرکردہ لیڈر اور افراد ان سے ملنا چاہتے تھے اور کئی اداروں کی جانب سے دعوت نامے بھی موصول ہوئے لیکن وہ مجبور تھے۔

ملنے جلنے والوں کے پیہم اصرار اور بھرمار، اور اس پر طرہ یہ کہ صحت اب مزید محنت کی اجازت نہیں دے رہی تھی، انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں زیارت منتقل ہو جانا چاہیے۔ زیارت زیادہ صحت افزا مقام بھی تھا۔ زیارت کی ریذیڈنسی ایک بلند و بالا پہاڑی پر واقع تھی جہاں وسیع وعریض باغات تھے۔ پرندے صبح و شام چہچہاتے رہتے۔ پھل دار درخت چاروں طرف لہلہاتے اور حسن فطرت کو نمایاں کرتے۔ قائداعظم کو یہ جگہ بہت پسند آئی۔

کوئٹہ ڈویژن کے کمشنر کی اہلیہ کے ذریعے مجھے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ ۵ (۵ ڈاکٹر ریاض علی شاہ (1964 - 1901) کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے پروفیسر تھے۔ جولائی 1948ء کے آخری ہفتے میں انہوں نے قائداعظم کا معائنہ کیا تھا اور اُن کی وفات تک اکثر و بیشتر معائنہ کرتے رہے۔ آپ نے اپنی یادداشتیں بھی مرتب کی جس کا عنوان ''قائداعظم کے آخری ایام'' ہے۔ ڈاکٹر صاحب، ٹی بی ایسوسی ایشن کے سرپرست بھی رہے۔) کسی مریض کو دیکھنے زیارت آ رہے ہیں چنانچہ اگر قائداعظم اجازت دیں تو وہ ان کا معائنہ بھی کر لیں گے۔ لیکن قائداعظم نے انکار کر دیا۔ وہ اپنے آپ کو بیمار تصور کرنے پر تیار ہی نہیں تھے اور ڈاکٹروں سے ملاقات کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرتے تھے۔ لیکن اب انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں

مزید خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر قائداعظم کے پرائیویٹ سیکریٹری فرخ امین ٦ (٦ فرخ امین نے بھی اپنی یادداشت قائداعظم کے بارے میں لکھی ہیں۔ ان کی وفات 12، ستمبر 1969ء کو ہوئی۔) کو کہا کہ وہ جنرل سیکریٹری چودھری محمد علی ۷ (۷ چودھری محمد علی (1980 - 1905) انہوں نے 1928ء میں انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس سے ملازمت کا آغاز کیا۔ بعد میں حکومت پاکستان کے سیکریٹری جنرل مقرر ہوئے اور وزیراعظم پاکستان بھی رہے) کو فون کریں اور اُن سے کہیں کہ وہ لاہور سے ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش ۸ (۸ کرنل الٰہی بخش (1960 - 1904) کنگ ایڈورڈ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ ''قائداعظم کے آخری ایام'' کے مصنف بھی ہیں۔ برطانیہ میں تعلیم حاصل کر کے انڈین میڈیکل سروس میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1936ء میں کے۔ای۔ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ جنگ عظیم دوم میں ان کی خدمات فوج نے حاصل کر لی۔ آزادی کے بعد کے۔ای۔ کالج کے پرنسپل ہو گئے اور قائداعظم کے معالج رہے۔) کو فوری طور پر یہاں بھیجنے کا بندوبست کریں۔ یہ بات 21، جولائی 1948ء کی ہے۔

ہم بے چینی سے کرنل الٰہی بخش کی آمد کے منتظر تھے۔ قائداعظم کی تکالیف میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ چاق و چوبند دکھائی دے رہے تھے۔ 23، جولائی کو فرخ امین نے بتایا کہ کرنل الٰہی بخش زیارت پہنچ چکے ہیں اور نچلی منزل پر قائداعظم کے منتظر ہیں۔ میں نے جب بھائی جان کو بتایا تو انہوں نے بڑے خشک لہجے میں کہا، ''اب بہت شام ہو چکی ہے، ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ وہ کل صبح تشریف لائیں۔'' میں نے انہیں راضی کرنے کی کوشش کی کہ ڈاکٹر کو ابھی معائنے کی اجازت دے دیں۔ وقت ضائع کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ لیکن وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

دوسرے دن صبح جب کرنل الٰہی بخش آئے تو بجائے اس کے کہ ڈاکٹر ان سے کوئی سوال پوچھتے، وہ خود ہی بول پڑے، ''ڈاکٹر! مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔'' اس سوال کا جواب دے کر ڈاکٹر صاحب نے اُن کی تکالیف کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی۔ قائداعظم نے 1934ء کے بعد سے اب تک کے حالات ٹھیک ٹھیک بتا دیئے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی اصرار کرتے رہے کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس معدہ ذرا گڑبڑ کرتا ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہو جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بس مسئلہ یہ ایک اور ہے کہ میں گذشتہ چودہ (14) سال

سے مسلسل چودہ (14) گھنٹے کام کرتا رہا ہوں اس لیے کبھی کبھار اور بخار کا حملہ بھی ہو جاتا ہے۔ اب چند دنوں سے یہ حملہ ذرا شدت سے ہو رہا ہے جس کی وجہ سے میں نقاہت کا شکار ہو گیا ہوں۔"

اتنی سی بات کہتے کہتے وہ نڈھال ہو گئے اور پھر کھانستے کھانستے انہوں نے کہا، "چند روز قبل مجھ پر نزلہ اور سردی نے حملہ کیا۔ اُس دن سے میں پنسلین کھا رہا ہوں۔ پندرہ برس قبل لندن کے ایک ڈاکٹر نے مجھے معدے کے آپریشن کا مشورہ دیا تھا لیکن جب جرمنی کے ڈاکٹر نے دیکھا تو اس نے کہا کہ میرا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بعد بمبئی کے ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ آپ دل کے مریض ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خود ڈاکٹروں میں بھی اتفاق نہیں ہے اور وہ میرا مرض درست طور پر پہچان نہیں پائے ہیں۔"

کرنل صاحب خاموشی سے سنتے رہے اور پھر تفصیلی معائنے کے بعد کہا کہ آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن سینے اور پھیپھڑوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہی کچھ صحیح بات بتا سکوں گا۔ آپ ضروری آلات اور میری مدد کے دو تین ڈاکٹروں کا بندوبست کریں۔ اس کے علاوہ آپ قوت بخش غذا کا استعمال جاری رکھیں اور پیٹ بھر کے تینوں وقت کھایا کریں۔ آپ کی غذا میں دودھ، انڈے، مکھن، مرغی کا گوشت، سبزیاں اور جیلی بھی شامل ہونی چاہئیں۔

قائداعظم نے مسکراتے ہوئے کہا، "ڈاکٹر! یہ تو بہت زیادہ ہو جائے گا۔ کیا میرا معدہ یہ سب سنبھال لے گا؟"

"جی ہاں جناب! آپ بے فکر ہو کر یہ سب غذائیں استعمال کریں۔ آپ کو حراروں کی سخت ضرورت ہے۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح ڈاکٹر صدیقی سول سرجن کوئٹہ اور ڈاکٹر محمود پیتھالوجسٹ ضروری ساز و سامان لے کر آ گئے۔ خون اور بلغم کے ٹیسٹ لیے گئے۔ نتائج انتہائی خطرناک ثابت ہوئے۔ کرنل الٰہی بخش نے انہیں ان نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے کہا، "ٹیسٹ کے نتائج بتا رہے ہیں کہ آپ کے پھیپھڑے بری طرح متاثر ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ کہ مجھے ٹی بی ہے؟" قائداعظم نے اپنی خلش کا اظہار کیا۔ "آپ یہ بتائیں کہ یہ بیماری مجھے کتنے عرصے سے ہے؟"

"تقریباً دو سال سے۔ مگر میں یہ شک دور کرنے کے لیے ایک بار اور آپ کے سینے کا ایکسرے کرنا چاہوں گا۔ ویسے معاملہ سنگین نہیں ہے۔ علاج اور باقاعدہ خوراک کے ذریعہ آپ جلد صحت مند ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"آپ کو اس بات کا اندازہ ہے کہ مجھ پر بہت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہیں؟ اگر میری بیماری نے مجھے کام کرنے کی اجازت نہ دی تو ملک اور قوم کو اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔" قائد اعظم نے پریشانی کے عالم میں فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب سوائے تسلی دینے کے اور کیا کہہ سکتے تھے۔

میں اس وقت اپنے بھائی کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اُن کا چہرہ زرد اور جسم نقاہت کا شکار۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا، "فاطمہ! اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ مجھے بہت پہلے ہی ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔ خیر پھر بھی کوئی بات نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا اور اپنے فرائض انجام دیتا رہوں گا۔"

اب انہوں نے دوا کا باقاعدہ استعمال شروع کر دیا تھا اور کھانا بھی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کھاتے تھے۔ ایک بہترین باورچی امانت علی کو میں نے ملازم رکھ لیا جو پیرس کے رِٹز ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ وہ مہاراجہ کپورتھلہ کا خانساماں بھی رہا۔ ایک لیڈی کمپاؤنڈر بھی رکھی گئی جس کا تقرر ڈاکٹر الٰہی بخش نے کیا تاکہ وہ باقاعدہ قائد اعظم کا ٹمپریچر نوٹ کرتی رہے۔ وہ اپنے اصولوں کی سخت پابند تھی۔ قائد اعظم نے جب بھی پوچھا کہ میرا ٹمپریچر کتنا ہے تو وہ جواب دیتی کہ یہ بات مریض کو نہیں بتائی جاتی، میں صرف ڈاکٹر کو ہی اطلاع دوں گی۔

قائد اعظم سے ملاقات کی اجازت کسی کو نہ تھی، لیکن جب واشنگٹن میں سفیر پاکستان جناب حسن اصفہانی (حسن اصفہانی (1980 - 1902) قائد اعظم کے قابل اعتماد ساتھی اور تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما تھے۔ پاکستان کی پہلی اسمبلی کے ممبر بنے۔ امریکا میں پاکستان کے سفیر رہے اور حکومت پاکستان کے وزیر صنعت و تجارت (1955-1954) کا عہدہ بھی سنبھالا۔) زیارت آئے تو قائد اعظم نے انہیں فوراً بلوا لیا اور خوب بے تکلفی سے باتیں کیں۔ مگر حسن اصفہانی کا چہرہ افسردہ تھا۔ وہ اپنے قائد کی ناسازیٔ طبع اور نازک حالت دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ

پا سکے اور رو پڑے۔ انہوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے درخواست کی کہ ضروری اور مطلوبہ ادویات کی فہرست انہیں دے دیں تاکہ وہ یہ دوائیں امریکا سے منگوالیں اور قائداعظم جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام دواؤں کے نام لکھ دیئے۔ بعض دوائیں ان دنوں پاکستان میں دستیاب نہیں تھیں۔

ڈاکٹر الٰہی بخش کی ہدایت پر لاہور سے ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ایکسرے اسپیشلسٹ، ڈاکٹر عالم اور کلینکل اسپیشلسٹ ڈاکٹر غلام محمد تمام ساز و سامان لے کر آ گئے اور نتیجے کے طور پر تصدیق ہو گئی کہ قائداعظم ٹی بی کے مریض ہیں۔ قائداعظم کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس رکھنے کا فیصلہ ہوا۔ پہلے تو قائداعظم راضی نہ ہوئے کہ رقم ضائع ہو گی لیکن بعد میں یہ کہہ کر راضی ہو گئے کہ دن بھر تو میری بہن میرے ساتھ رہتی ہے۔ رات کے لیے نرس رکھ لیجیے۔ چنانچہ اس طرح سسٹر فلس ڈینیم کا تقرر ہو گیا جو سول ہسپتال کوئٹہ میں کام کر رہی تھی۔ وہ ایک اچھی اور فرض شناس نرس ثابت ہوئی۔ سسٹر فلس نے ڈاکٹر الٰہی بخش کو مطلع کیا کہ قائداعظم باقاعدہ ریشمی پاجامہ پہنتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں رات میں سردی لگتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فی الفور کراچی (Vivella) منگوالیا اور میں نے اُس کے پاجامے تیار کروائے۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ پاجامہ اُن کے لیے آرام دہ ہیں۔ اب وہ دیر تک سوتے ہیں۔ خوراک بھی وہ زیادہ استعمال کرنے لگے ہیں۔ ٹمپریچر معمول پر آ گیا تھا۔ کھانسی کم ہو گئی تھی اور خون کا دباؤ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔

جولائی کے آخر میں ایک روز اچانک وزیر اعظم لیاقت علی خاں، چودھری محمد علی کے ہمراہ زیارت پہنچ گئے اور ڈاکٹر الٰہی بخش سے مل کر قائداعظم کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ مگر ڈاکٹر الٰہی بخش نے کہا کہ وہ مریض کی اجازت کے بغیر کسی کو کوئی اطلاع فراہم نہیں کر سکتے۔ دونوں حضرات ہماری رہائش پر آ گئے۔ قائداعظم اُن سے ملاقات کے لیے نچلی منزل پر آئے حالانکہ وہ بہت تھکے ہوئے تھے اور رات بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ لوگ آدھے گھنٹے تک قائد کا حال احوال دریافت کرتے رہے۔

اب 14 راگست کا دن قریب آ رہا تھا، ہماری قوم آزادی کی پہلی سالگرہ بڑے جوش و خروش اور دھوم دھام سے منانا چاہتی تھی۔ قائداعظم اس موقع پر اپنی تقریر کے بارے میں فکر مند تھے۔

اگرچہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔ مگر خرابی صحت کے باوجود انہوں نے اپنی تقریر مکمل کی اور پیغام بھی کہا گیا تھا۔

''پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمارے دشمن ابھی تک ہمارے بارے میں مشکوک ہیں اور اُن کی کوشش ہے کہ ہماری حکومت کو ناکام بنادیں، مگر مجھے اپنی قوم پر پورا بھروسہ ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ ان کے تمام ہتھکنڈوں کو ناکام بنادیں گے اور اس نوزائیدہ مملکت کو جلد ہی ایسے مقام پر پہنچادیں گے کہ دنیا انگشت بدنداں رہ جائے گی۔ ہر شعبے میں ہماری کارکردگی نمایاں ہے اور یہ ترقی برابر جاری رہے گی۔ خدا ہمارا حامی و ناصر ہو۔''

چند روز بعد جب ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو دیکھا کہ خون کا دباؤ کم ہو رہا ہے، پاؤں بھی سوج گیا ہے اور پیشاب رک رک کر کم مقدار میں آرہا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دل اور گردے کمزور ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم نے فیصلہ کیا اب زیارت میں رہنے کے بجائے کوئٹہ میں قیام کیا جائے۔ 13، اگست کو ہم کوئٹہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ انہوں نے سلیپنگ سوٹ میں سفر کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ایک نیا سوٹ نکالا۔ میچ کرتی ہوئی ٹائی لگائی، آرائشی رومال جیب پر اُڑسا اور چمکدار نئے پمپ شوز پہنے۔ انہیں اسٹریچر کے ذریعے نیچے لایا گیا اور بڑی کار کی پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ اس کار میں ہمارے ساتھ سسٹر فلس ڈینیم ایک کرسی پر الگ بیٹھی تھی اور قائد اعظم کے اے ڈی سی شوفر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کار کی رفتار کم رکھی گئی کیونکہ راستہ ناہموار تھا اور ہچکولے بہت تھے۔ چار گھنٹے کا سفر طے کر کے ہم کوئٹہ پہنچے۔ راستے میں ان کو چائے و بسکٹ دیئے گئے۔ ریذیڈنسی پہنچتے ہی ڈاکٹروں نے فوراً ان کا معائنہ شروع کر دیا اور پھر اطمینان کا اظہار کیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔

ان کو سانس لینے ہی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہ کہہ رہے تھے کہ میں بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے مشورہ دیا کہ روزانہ ایک گھنٹہ فائلیں دیکھا کریں تا کہ ان کی توجہ اپنی صحت کی طرف سے ذرا ہٹ جائے۔ وہ کام کر کے بے حد خوشی محسوس کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں نے کہا کہ روزانہ چند قدم کمرے میں ہی چل لیا کریں تا کہ خون کی گردش رواں رہے۔ اب اور بھی وہ خوشی محسوس کرنے لگے اور ان کو یقین ہو گیا کہ وہ جلد بستر علالت سے اٹھ کھڑے

ہوں گے۔ ایک دن بولے، "ڈاکٹر! میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر الٰہی بخش نے کہا، "ٹھیک ہے، آپ دن بھر میں صرف ایک سگریٹ پی سکتے ہیں اور دھواں اندر مت لیں۔"

میں ان کے پسندیدہ برانڈ کا ایک پیکٹ لے آئی۔ بیماری سے قبل وہ دن بھر میں پچاس سگریٹ پی جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کی اجازت کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے پہلے دن پانچ سگریٹ پی لیے۔ ڈاکٹر نے جب تشویش کا اظہار کیا تو بولے میں نے دھواں اندر نہیں لیا۔ ڈاکٹر مسکرایا اور وہ ایک بچے کی طرح خوش ہو گئے۔

عیدالفطر 7، اگست کو آ رہی تھی۔ ا(۱۰ 7، اگست 1948ء) وہ قوم کے نام عید کا پیغام تیار کرنے میں مصروف تھے۔ یہ اُن کی زندگی کی آخری تقریر ثابت ہوئی جس میں انہوں نے کہا "ہم اسی وقت اپنے خوابوں کو حقیقت کے روپ میں ڈھال سکتے ہیں جب ہمیں ایک خاص مقصد پر پورا یقین ہو اور اُسی نشان کو لے کر ہم آگے بڑھ رہے ہوں۔ مشرقی پنجاب میں ہونے والے ظلم وستم جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد پیش آئے انہوں نے ہماری خوشیاں چھین لیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس عید کی آمد آمد تک ہم نے بے شمار دشواریوں پر قابو پالیا اور مہاجروں کو پاکستان میں بسانے اور انہیں روزگار فراہم کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمارے مصائب ختم ہو گئے ہیں، ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا اور آگے بڑھنا ہے۔ ہم تمام برادر اسلامی ممالک کو دوستی اور خیر سگالی کا پیغام دیتے ہیں۔ فلسطین، کشمیر اور انڈونیشیا میں جو ڈرامے رچائے جا رہے ہیں، ہمیں ان کی طرف بھی توجہ دینی ہے اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہیں۔ ہمیں ایک متحدہ محاذ بنانا پڑے گا۔ اسی صورت میں، ہم عالمی تنظیموں کو ہم ان بے انصافیوں کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ پوری ایمانداری اور خلوص کے ساتھ پاکستان سے وفاداری کا دم بھرتے ہیں اور کسی موقع پر آپ کے پیروں میں لغزش نہ آنے پائے۔"

یہ الفاظ ان کے آخری ریکارڈ شدہ الفاظ ثابت ہوئے۔ اگست کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ اچانک قائداعظم پر ایک اور حملہ ہوا اور وہ ہر چیز سے بیزار بیزار سے نظر آنے لگے۔ ایک دن بڑی حسرت زدہ لہجے میں کہنے لگے، "اب مجھے زندگی ...... بوجھ لگنے لگی ہے، جتنا جلدی ...... میں رخصت ہو جاؤں...... اتنا ہی بہتر ہے۔" یہ مایوس کن الفاظ سن کر مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ لیکن میں نے جلد ہی

اپنے آپ کو سنبھالا۔ اگر اس موقع پر میں انہیں تسلی نہ دیتی تو اور کون دیتا۔ ”نہیں، نہیں۔ ایسا مت کہیں۔ ملک اور قوم کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔“

اُن کے لبوں پر بے بسی پھیل گئی، ایک ایسی مسکراہٹ چہرے پر آئی جس میں بے رونقی سی تھی۔ ”بس اب میرا وقت ختم ہو چکا۔“ ڈاکٹر الٰہی بخش نے بتایا کہ اُن کو برین ہیمرج ہو گیا ہے۔ یہ پہلی ستمبر کی بات تھی۔ ”میرے خیال میں انہیں فوراً کراچی لے جانا چاہیے۔“ 5، ستمبر کو بلغم کے معائنے سے معلوم ہوا کہ ان پر نمونیے کے آثار ہیں اور خون میں چھوت کی علامات ہیں۔ ان کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے 7، ستمبر کو مسٹر اصفہانی کو فون کیا کہ امریکا سے اُسی اسپیشلسٹ کو پاکستان بھیجیں جس کی ڈاکٹر ریاض نے سفارش کی تھی۔ دوسرے دن میں نے کراچی میں ڈاکٹر محمد علی مستری (ڈاکٹر محمد علی مستری، ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی میں پروفیسر تھے۔ لندن سے ایم۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور کافی عرصہ تک جے جے ہسپتال، بمبئی میں فزیشن رہے۔) کو فون کیا کہ فوراً کوئٹہ پہنچیں۔ فیصلہ ہوا کہ انہیں جلد از جلد کراچی لے جایا جائے۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ اب صرف کوئی معجزہ ہی ان کو بچا سکتا ہے۔ اپنے بھائی کو جب میں نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر آپ کو کراچی لے جانا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا، ”ہاں ہاں، مجھے کراچی لے چلو، میں وہی پیدا ہوا تھا اور وہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔“

میں اُن کے بستر کے قریب ہی موجود رہی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہے تھے ”کشمیریوں کو ...... اپنا فیصلہ کرنے ...... کا حق ...... ملنا چاہیے ...... مہاجرین کی مدد کرو ...... آئین پاکستان ...... میں جلد ...... مکمل کرلوں گا۔“

ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ 11، ستمبر کو بعد دوپہر کراچی لے جایا جائے جس کے لیے ہمیں دو بجے دوپہر ایئر پورٹ پہنچنا ہوگا۔ ایک اسٹریچر پر انہیں جب کیبن میں لے جایا جا رہا تھا تو طیارے کا پائلٹ اور عملہ انہیں سلامی دینے کے لیے ایک قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قائد اعظم نے بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھایا اور ان کے سلام کا جواب دیا۔ سیٹوں کو آرام دہ بنا کر ہم نے اُسے ایک بستر کی شکل دے دی تھی۔ ڈاکٹر مستری اور میں اُن کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پائلٹ نے ہمیں مطلع کر دیا تھا کہ پہلے کچھ دیر طیارہ سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرے گا لیکن بلوچستان کی پہاڑیاں عبور کرتے ہی اس

کی رفتار پانچ ہزار فٹ ہو جائے گی۔ آکسیجن ماسک اور سلنڈر بالکل تیار تھے کیونکہ زیادہ بلندی پر انہیں آکسیجن فراہم کرنی تھی۔ جہاز بلند سے بلندتر ہوتا جارہا تھا۔ قائداعظم کو سانس لینے میں ذرا دشواری ہونے لگی تو میں نے گیس ماسک ان کے منہ پر لگا دیا۔ مگر انہوں نے ماسک ہٹا کر میری طرف یوں دیکھا گویا کہہ رہے ہوں، ''اب کوئی فائدہ نہیں۔ وقت ختم ہو چکا ہے۔'' ڈاکٹر الٰہی بخش نے دوبارہ ماسک اُن کے منہ سے لگا دیا۔

سوا چار بجے ہم ماڑی پور ایئر پورٹ پر اتر گئے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک برس پہلے جب وہ اترے تھے تو بڑے پر اعتماد تھے اور بڑے دبنگ لہجے میں کہہ رہے تھے کہ پاکستان کو ایک عظیم قوم بنائیں گے۔ اُس وقت آپ کے استقبال کے لیے یہاں ہزاروں افراد جمع تھے۔ لیکن آج یہاں سناٹا تھا۔ اس بات کی ہدایت کر دی گئی تھی کہ آج یہاں کوئی نہ آئے۔ ہمارا استقبال کرنے والا پہلا شخص گورنر جنرل کا ملٹری سیکریٹری کرنل جیفرے نولز تھا۔ اسٹریچر پر لٹا کر قائداعظم کو ایک فوجی ایمبولینس تک لے جایا گیا جو انہیں گورنر ہاؤس لے جانے کے لیے تیار تھی۔ مسز فلس اور میں ان کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گئے۔ ایمبولینس بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ دیگر افراد کاروں کے ذریعے پہلے ہی آگے جا چکے تھے۔ صرف ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر مستری اور ملٹری سیکریٹری گورنر جنرل کی کیڈلک کار میں پیچھے پیچھے آرہے تھے۔

بڑی مشکل سے ایمبولینس نے چار میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ آہستہ آہستہ ذرا سا آگے بڑھ کر ایک جگہ بالکل ہی رک گئی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو بتایا گیا کہ پٹرول ختم ہو گیا ہے۔ ڈرائیور گھبرا کر انجن کا معائنہ کرنے لگا مگر پٹرول ہی نہ تھا تو وہ کیا کرتا۔ میں جلدی سے دوبارہ ایمبولینس میں داخل ہو گئی۔ قائداعظم کے دائیں ہاتھ میں حرکت ہوئی اور انہوں نے سوالیہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں نے انہیں اصل بات بتانے کے بجائے بتایا کہ ایمبولینس کا انجن اچانک خراب ہو گیا ہے۔ یہ سن کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کراچی میں عموماً تیز سمندری ہوائیں چلتی ہیں، جس کی وجہ سے درجہ حرارت کم رہتا ہے مگر اس روز ہوا بالکل بند تھی اور گرمی کافی شدید تھی۔ مزید طرہ یہ کہ مکھیاں ان کے چہرے پر بھنبھنانے لگیں اور ان کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ بھگا سکیں۔ میں اور مسز فلس باری باری پنکھا جھل رہے

تھے اور دوسری ایمبولینس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ایک لمحہ کرب واذیت کے ساتھ گزر رہا تھا۔ کیڈلک کار میں انہیں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں اسٹریچر نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ہم انتظار ہی کرتے رہے۔ مہاجرین کی جھونپڑیاں قریب ہی موجود تھیں لیکن انہیں یہ خبر نہ تھی کہ اُن کو ایک آزاد ملک عطا کرنے والا قائد اس کسمپرسی کے عالم میں ان کے قریب ہی موجود ہے۔ کاریں ہارن بجاتی ہوئی گزرتی جا رہی تھیں اور وہ ایک ایمبولینس میں بے بس پڑے تھے جس کا پٹرول ختم ہو چکا تھا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ یہ ایک انتہائی کربناک لمحات تھے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور قائد اعظم کی زندگی دم توڑ رہی تھی۔ اب ایک دوسری ایمبولینس آئی قائد اعظم کو اسٹریچر کے ذریعہ دوسری ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور ہم گورنر جنرل ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ دو گھنٹے میں ہم کوئٹہ سے کراچی پہنچے اور ماڑی پور سے گورنر ہاؤس آنے میں بھی دو گھنٹے لگ گئے۔

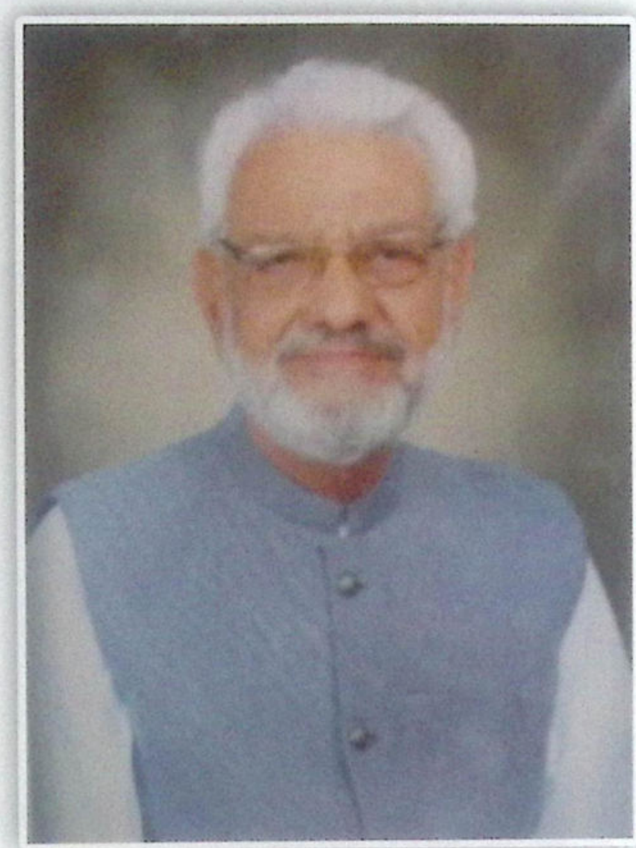
وہ بستر پر لیٹے ہی سو گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اس سفر کی وجہ سے اُن کی صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحبان یہ کہہ کر چلے گئے اب میں وہاں تنہا رہ گئی۔ میرے بھائی جان آرام سے سو رہے تھے۔ نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ بس اب آخری وقت آ گیا ہے۔ وہ تقریباً دو گھنٹے تک سکون سے سوتے رہے۔ پھر آنکھیں کھلیں اور انہوں نے مجھے دیکھا، ''فاطمہ! خدا حافظ۔'' اُن کا سر دائیں جانب ڈھلک گیا۔ میں روتی دھوتی اور چیختی چلاتی باہر آئی اور ڈاکٹروں کو آواز دینے لگی۔

جلد ہی ڈاکٹر حضرات آ گئے اور معائنہ کر کے انجکشن لگاتے رہے لیکن اب وہاں کیا دھرا تھا۔ انہوں نے ہمارے قائد اعظم کے جسم کو ایک سفید چادر سے ڈھک دیا۔ کرنل الٰہی بخش غم زدہ انداز میں میرے قریب آئے، کاندھے پر ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ مگر میری آنکھیں خشک تھیں اور آواز خاموش۔

ان کے انتقال کی خبر فوراً ہی چاروں طرف پھیل گئی۔ گورنر جنرل ہاؤس کا بڑا آہنی پھاٹک چوپٹ کھول دیا گیا تاکہ جو بھی آنا چاہے آ سکے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا جس پر قوم قیامت تک ماتم کرتی رہے گی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

◆◆◆



محمود اختر خان

Rang-e-Adab Publications

Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.

0345-2610434 0336-2085325

021-32761100 0300-2054154

rangeadab@yahoo.com /rangeadab



Rs: 500/-